جنوری ۲۰۰۳ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ALLAH Tests Us Often

Allah knows what's best for us
So why should we complain
We always want the sunshine
But He knows there must be rain
We always want the laughter
And the merriment of cheer
But our hearts will lose their tenderness
If we never shed a tear

Allah tests us often
With suffering and with sorrow
He tests us not to punish us
But to help us meet tomorrow
For growing trees are strengthened
If they withstand the storm
And the sharp cut of the chisel
Gave the marble grace and form

Allah tests us often
And for every pain He gives to us
Provided we're patient
Is followed by rich gain
So whenever we are down
And whenever we feel that
Everything is going wrong
It is just Allah's way
To make our spirit strong

(Muhammad Sohail Qureshi)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد:	۵۲
شمارہ:	۱
ذوالقعدہ	۱۴۲۳ھ
جنوری	۲۰۰۳ء
فی شمارہ	۱۲/-
اس شمارے کی قیمت	۲۰/-

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

☆ اندرون ملک	125 روپے
☆ ایشیا' یورپ' افریقہ وغیرہ	800 روپے
☆ امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ	1000 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36-کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700' فون: 03-02-5869501

فیکس: 5834000 ای میل: anjuman@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67-گڑھی شاہو' علامہ اقبال روڈ' لاہور

فون: 6316638-6366638 فیکس: 6305110

ای میل: markaz@tanzeem.org

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

✿ **عرض احوال** ________ ۳
سرحداور بلوچستان۔ کرنے کا ایک اہم کام — حافظ عاکف سعید

✿ **منتخب نصاب۔۲** ________ ۵
اقامت دین کی جدوجہد کرنے والوں کے اوصاف
ڈاکٹر اسرار احمد

✿ **دعوت و تحریک** ________ ۲۷
تحریک اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ۔ یا چناں کن یا چنیں!
ڈاکٹر اسرار احمد

✿ **فریضہ اقامت دین** ________ ۴۴
قیام خلافت: اُمت کا فرض منصبی
سید وصی مظہر ندوی

✿ **توضیح و تنقیح** ________ ۵۳
''اسلام اور موسیقی'' — مولانا عبدالغفار حسن

✿ **دعوت فکر** ________ ۸۲
فرض آپ کو پکار رہا ہے! — مولانا محمد یوسف اصلاحی

✿ **اتباع سنت** ________ ۸۷
بدعات کیوں قابل مذمت ہیں؟
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

✿ **منہاج المسلم** (۲۶) ________ ۹۵
مخلوق سے تعلق کے آداب — علامہ ابوبکر الجزائری

✿ **گوشہ خواتین** ________ ۱۰۷
سچی مسلمان خاتون کا کردار اور جدید خواتین
این کے نذر اخیل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض احوال

سرحد اور بلوچستان ــــ کرنے کا ایک اہم کام

اخباری اطلاعات کے مطابق صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت نے غیر اسلامی شعائر کے خلاف کریک ڈاؤن کا آغاز کر دیا ہے۔ صوبے میں موجود چار شراب فیکٹریوں اور متعدد جوا خانوں پر بلڈوزر چلا دیئے گئے ہیں' سینماؤں سے ہیجان خیز پوسٹر اتار لئے گئے ہیں اور پابندی لگا دی گئی ہے کہ آئندہ سینماؤں کے باہر صرف فلم اور ایکٹروں کے نام لکھنے کی اجازت ہو گی' تصویری پوسٹر ہرگز برداشت نہیں کئے جائیں گے ــــ اسی طرح بلوچستان کی حکومت نے بھی نہ صرف یہ کہ فحاشی کے خلاف کارروائی کرنے اور منی سینما گھر ختم کرنے کے عزم کا اظہار کیا ہے بلکہ صوبہ بلوچستان میں مولانا مفتی محمودؒ کی ۲۲ اصلاحات کے نفاذ کا فیصلہ بھی کیا ہے۔

یہ تمام فیصلے اور اقدامات خوش آئند بھی ہیں اور توقع کے مطابق بھی۔ ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا حکومتی سطح پر اہتمام ایک اسلامی معاشرے میں ازبس ضروری ہے۔ ان اقدامات کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ اس امر میں اختلافِ رائے ہو سکتا ہے کہ ایم ایم اے کی حکومت ترجیحات کا تعین درست طور پر کر پائی ہے یا نہیں! ــــ بعض لوگوں کی رائے یہ ہو سکتی ہے کہ عدل وانصاف کو یقینی بنانا' عوام کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنا' معاشی ظلم وجبر کے خاتمے کی طرف توجہ دینا اور زکوٰۃ کے نظام کو بہتر بنا کر اس کی درست تقسیم کو یقینی بنانا اولین توجہ کے متقاضی تھے' تاہم اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اب تک جو اقدامات کئے گئے ہیں اور جن اقدامات کا عزم ظاہر کیا گیا ہے وہ یقیناً اصلاحِ معاشرہ اور نفاذِ شریعت کے وسیع تر عمل کا ایک حصہ ہیں ــــ جہاں تک مولانا مفتی محمودؒ کی مرتب کردہ ۲۲ اصلاحات کا تعلق ہے' اس کی تفصیلات اگرچہ ہمارے سامنے نہیں ہیں لیکن یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ اصلاحات بھی یقیناً دین وشریعت کے نفاذ کے حوالے سے مثبت پہلو کی حامل ہوں گی اور ان کا نفاذ معاشرہ کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے ضمن میں مفید ومؤثر ثابت ہوگا۔ ہم صوبہ سرحد وبلوچستان میں قائم متحدہ مجلس عمل کی حکومت کے لئے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ناموافق حالات میں نفاذِ شریعت کے اس کڑے امتحان میں سرخرو فرمائے اور انہیں توفیق دے کہ وہ اپنی مخلصانہ کاوشوں اور حسنِ تدبیر وعمل سے ان دو صوبوں میں نفاذِ شریعت کی برکات کا وہ نمونہ پیش کر سکیں کہ پھر پاکستان کے دیگر صوبے بھی ان کی تقلید کرنے پر مجبور ہو جائیں اور پورے پاکستان کے حوالے سے فی الواقع مصورِ پاکستان کا یہ خواب

ایک زندہ حقیقت بن جائے کہ ؎

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اور

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!

☆ ☆ ☆

متحدہ مجلس عمل کے لئے ہمارا ایک پُر خلوص مشورہ یہ ہے کہ وہ سرحد و بلوچستان میں ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کے اہم دینی فریضے کی ادائیگی کو یقینی بنانے کے ساتھ ساتھ عوام میں صحیح دینی فکر کی آ گہی اور شعور کو اجاگر کرنے کا مؤثر سامان بھی ضرور کریں ـــــ نظامِ جمعہ کے حوالے سے علماء کرام کے پاس دینی نقطہ نگاہ سے عوام کی تعلیم وتربیت کا ایک نہایت مؤثر ذریعہ اور پلیٹ فارم موجود ہے۔ یہ وہ عظیم نظام ہے جو دراصل امت میں تعلیم قرآن کے ایک محکم نظام کے طور پر تشکیل دیا گیا تھا اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ ''کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی۔'' اس بنے بنائے پلیٹ فارم کو صحیح طور پر بروئے کار لاکر قرآن وسنت کی تعلیمات کے ذریعے عوام کی فکری و عملی رہنمائی کا خاطر خواہ انتظام کیا جا سکتا ہے۔ شریعت پر عمل پیرا ہونے کی خاطر جہاں عوام کو ضروری فقہی مسائل سے روشناس کرانا ضروری ہے وہاں دین وشریعت پر انشراح صدر کے حصول کی خاطر عوام الناس اور بالخصوص پڑھے لکھے طبقات کی ذہنی وفکری تربیت کا مناسب اہتمام بھی ناگزیر ہے۔ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے غلط افکار ونظریات جو قریباً سب کے سب انکارِ خدا اور مادہ پرستانہ نقطہ نظر پر مبنی ہیں' پڑھے لکھے طبقات کے ذہنوں کو پراگندہ کئے ہوئے ہیں۔ فکر قرآنی کی شمشیر سے ان باطل نظریات کا قلع قمع کر کے توحید پر مبنی مثبت انقلابی فکر کی ذہنوں میں آبیاری کئے بغیر ملک میں کسی موثر اور پائیدار تبدیلی کی توقع کرنا اور پورے ملک میں اسلامی نظام کے غلبہ و قیام کی آرزو کرنا حقیقت پسندانہ اور دانشمندانہ سوچ کا مظہر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے یہ دینی راہبر اگر اس جانب خاطر خواہ توجہ دیں تو نہ صرف یہ کہ صوبہ سرحد و بلوچستان میں نفاذِ شریعت کے عمل کو زیادہ موثر بنایا جا سکتا ہے بلکہ پورے پاکستان میں اسلام کے غلبہ وقیام کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو ان شاء اللہ یہ چیز اسلام کے عالمی احیاء کا پیش خیمہ ثابت ہو گی۔ **اللھم وفقنا لھذا!!**

(اقامت دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت کے اوصاف اور تنظیمی مسائل کے ضمن میں ہدایات)

درس ۱

اقامت دین کے لئے کام کرنے والوں کے
مطلوبہ اوصاف

نحمدہٗ ونصلّی علی رسولہ الکریم ...... امّا بعد:

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۞ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؗ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۛۚ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ۛ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ۞﴾ (الفتح: ۲۸ ـ ۲۹) ...... صدق اللہ العظیم

ان نشستوں میں ہم مطالعہ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب نمبر ۲ کا سلسلہ وار مطالعہ کریں گے جو خاص طور پر اقامت دین یا ''اظہارُ دینِ الحقّ علی الدِّینِ کُلِّہٖ '' کے لئے قائم ہونے والی اجتماعی قوت یا جماعت سے متعلق مسائل سے بحث کرتا ہے۔ ہمارا بنیادی منتخب نصاب جو ہماری پوری دعوت وتحریک کی اساس بنا ہے اس سے آپ میں سے ہر شخص بخوبی واقف ہے۔ اس میں جہاں تک اوصاف کا تعلق ہے' افراد میں جو اوصاف مطلوب ہیں ان کا ذکر اعمالِ صالحہ کے ضمن میں آتا ہے کہ ایمان کا جو نتیجہ انسان کے سیرت وکردار اور اس کے اعمال میں رونما ہونا چاہئے اور اس کے جن

اثرات وثمرات کاظہور انسانی شخصیت میں ہونا چاہئے وہ کیا ہیں۔

اس منتخب نصاب کے تیسرے حصّہ میں سب سے پہلے ہم نے انفرادی کردار اور انفرادی سیرت سے متعلق مقامات شامل کئے کہ از روئے قرآن ایک فرد کی سیرت کن اساسات پر تعمیر ہوگی اور ایک پورے طور سے تعمیر شدہ انسانی شخصیت' تعمیر شدہ انسانی خودی' یا ایک پوری طرح mature انسان' جو قرآن کا انسانِ مطلوب ہے' اس کی شخصیت کے خدو خال کیا ہیں۔ چنانچہ ایک فرد کے اعتبار سے ابتدا اور انتہا' یعنی بنیادی اوصاف اور تکمیلی اوصاف کو منتخب نصاب میں شامل کیا گیا۔ جہاں تک بنیادی اوصاف کا تعلق ہے سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات اور ان کی بالکل ہم مضمون سورۃ المعارج کی آیات کے حوالے سے ہم نے یہ سمجھا کہ وہ عمل صالح جو انسان کی شخصیت میں پیدا ہونا چاہئے' اس کی اساسات کیا ہیں۔ یعنی عمل صالح کے اعتبار سے شخصیت کی تعمیر کن بنیادوں پر ہوگی۔ پھر ایک بندۂ مؤمن کی پختہ اور پوری طرح تعمیر شدہ شخصیت کی جھلک ہمارے سامنے سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں ''عباد الرحمٰن'' کے اوصاف کی صورت میں آ گئی' جہاں اس کی پوری طرح تکمیل شدہ وتیار (finished) اور ہر اعتبار سے پختہ (mature) حالت کی کامل تصویر کشی کر دی گئی۔

ہمارے اس منتخب نصاب کا حصّہ چہارم جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے مباحث پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اس میں قرآن حکیم کے وہ مقامات شامل ہیں جن میں دین کے غلبہ کے لئے جدوجہد کی فرضیت واضح ہوتی ہے۔ اس جدوجہد سے جی کترانے کا جو نتیجہ نکلتا ہے' یعنی نفاق' اس کے اعتبار سے سورۃ المنافقون شامل نصاب کی گئی ہے۔ پھر یہ کہ اقامت دین یا غلبہ دین کی جدوجہد کے ضمن میں اساسی منہاج سورۃ الجمعۃ میں بیان ہوا ہے۔ چنانچہ یہ مقامات اس میں شامل ہیں۔

مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا حصّہ پنجم مباحث صبر و مصابرت پر مشتمل ہے۔ یہ حصّہ تواصی بالصبر سے متعلق ہے کہ غلبہ دین کی جدوجہد میں بندۂ مؤمن کو جو تکالیف و مصائب' ابتلاآت اور آزمائشیں پیش آتی ہیں ان میں ثابت قدم رہنے کی ضرورت و اہمیت کے ضمن میں ہمیں قرآن مجید سے کیا ہدایات ملتی ہیں۔ لیکن اگر آپ

غور کریں گے تو یہ بات سامنے آ جائے گی کہ وہاں ایک خلا رہ گیا تھا۔ اور وہ یہ کہ اقامت دین کی جدوجہد کرنے والوں کو اپنے اندر جو خصوصی اوصاف پیدا کرنے لازم ہیں وہ کیا ہیں؟ اگر ان اوصاف میں کوئی کمی رہ گئی تو وہ ایک اچھا انسان تو ہوگا' اچھا مسلمان بھی ہوگا' اس کی شخصیت کے اندر ایک دلآویزی بھی پیدا ہو جائے گی' اور عباد الرحمٰن کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں وہ اپنے سیرت و کردار میں پیدا کر لے تو وہ یقیناً اللہ کا محبوب بندہ بھی ہوگا اور وہ عبد الرحمٰن کہلانے کا مستحق ہو جائے گا' لیکن وہ اس جدوجہد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ ہر سطح پر کچھ نئے تقاضے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ اقامت دین کی جدوجہد' جہاد فی سبیل اللہ' اللہ کے دین کو سربلند کرنے کی جدوجہد کے ضمن میں جن اضافی اور خصوصی اوصاف کی ضرورت ہے ان کو ہم نے اس منتخب نصاب نمبر ۲ میں شامل کیا ہے اور اس طرح جو خلا وہاں رہ گیا تھا اُسے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اسی طرح' جیسا کہ ہمیں معلوم ہے' اقامت دین کی جدوجہد ایک انقلابی جدوجہد ہے۔ لہٰذا قیامِ جماعت' التزامِ جماعت' نظم کا قیام' امیر اور مامور کا باہمی رشتہ جیسے موضوعات اس انقلابی جدوجہد کے لوازم میں سے ہیں۔ یہ موضوع ازخود نہایت اہم ہے کہ اس جماعت کی بنیاد کیا ہے' اس کی اساس کیا ہے' یہ کس طرح وجود میں آئی ہے' اس کا دستور کیا ہے' اس میں امیر کے حقوق اور اس کے فرائض کیا ہیں' مامورین کے حقوق و فرائض کیا ہیں اور ان کے باہمی مشورے کا نظام کیا ہوگا! اقامت دین کی جدوجہد کے ضمن میں یہ نہایت اہم موضوعات بھی ہمارے اس بنیادی منتخب نصاب میں موجود نہیں تھے۔ تو اصل میں اس خلا کو پر کرنے کے لئے یہ منتخب نصاب نمبر ۲ ترتیب دیا گیا ہے' جسے آپ چاہیں تو اُسی منتخب نصاب کا ضمیمہ یا تتمہ سمجھ لیں۔

اس منتخب نصاب نمبر ۲ کا اصل موضوع ''اقامت دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت کے اوصاف اور اس کے تنظیمی مسائل'' ہے۔ چنانچہ اس موضوع سے متعلق قرآن مجید کے کچھ مقامات منتخب کر کے اس میں شامل کئے گئے ہیں۔ اس کے اوّلین دو

مقامات درحقیقت اُس پہلے اور اصل منتخب نصاب اور اِس دوسرے منتخب نصاب کے مابین نقطہ اتصال ہیں اور ان کے باہمی ربط کو ظاہر کر رہے ہیں۔ سورۃ الحج کی آخری دو آیات میں شہادت علی الناس کا تصور ہمارے سامنے آیا: ﴿لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُھَدَاءَ عَلَی النَّاسِ﴾ اور شہادت علی الناس کی ذمہ داری کو ادا کرنے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جہاد کا ذکر آیا: ﴿وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ ھُوَ اجْتَبٰکُمْ﴾ ''جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ اس کے لئے جہاد کا حق ہے۔ اس نے تمہیں (اس مقصد کے لئے) چن لیا ہے۔'' درحقیقت اب اس کا تعلق سورۃ الصّف سے جڑ رہا ہے جس میں نہ صرف جہاد بلکہ قتال کا تصور دیا گیا ہے۔ سورۃ الصّف کی مرکزی آیات یہ ہیں:

﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ ۞ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۞ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ط ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۞﴾ (آیات ۹ تا ۱۱)

چنانچہ ازروئے قرآن جہاد فی سبیل اللہ کا پہلا ہدف ہے شہادت علی الناس اور دوسرا ہدف ہے ''اظھارُ دینِ الحقّ علی الدِّینِ کُلِّہٖ'' یعنی دین حق کو کل کے کل دین پر غالب کر دینا۔ سورۃ الصّف ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے اور متذکرہ بالا آیات اس کی مرکزی آیات ہیں' لہٰذا اس ضمن میں ہمارے منتخب نصاب کے دروس میں پورے شرح وبسط کے ساتھ بیان ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کہ ان آیات میں سے پہلی آیت' جس کو ایک روایت کے مطابق امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے پورے قرآن مجید کا عمود قرار دیا ﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ﴾ اس پر اللہ کے فضل وکرم سے نہ صرف ہمارے منتخب نصاب کے دروس میں تفصیل موجود ہے' بلکہ بڑی طویل بحثیں موجود ہیں۔

میرے اکثر وبیشتر کتابچے بلکہ بڑی کتابیں بھی میرے دروس وخطابات پر مشتمل ہیں' جنہیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا گیا ہے' لیکن مجھ پر اللہ کا بڑا اکرم ہوا ہے کہ چند اہم

موضوعات پر میرے قلم سے کچھ تحریریں نکلی ہیں اور شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے ''نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت'' نہایت اہمیت کی حامل تحریر ہے اور اس میں ۲۴ صفحات کا مقالہ اس ایک آیت پر مشتمل ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ﴾ اس مقالہ میں مَیں نے اللہ کے فضل وکرم سے اس آیت مبارکہ کے ضمن میں جو بھی ممکن سوال ہو سکتا تھا اس سے بحث کی ہے۔ اس کی ساری لغوی شرح وتراکیب' ضمائر کے جتنے بھی ممکنہ مراجع ہو سکتے ہیں اور اس بارے میں جتنی آراء پیش کی گئی ہیں ان کو سامنے رکھ کر سیر حاصل گفتگو کر چکا ہوں اور اس میں کسی اشتباہ کا امکان باقی نہیں رہا۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے بعض دانشور حضرات کا حال علامہ اقبال کے اس شعر کا مصداق ہے ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجے فقیہانِ حرم بے توفیق!

چنانچہ ایک صاحب نے اس بارے میں ہمارے موقف پر جرح کی ہے اور اس پر اعتراضات وارد کیے ہیں۔ اس آیۂ مبارکہ کے ضمن میں جو کچھ ہم بیان کرتے رہے ہیں اس پر ان صاحب نے اعتراض کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اس آیت سے یہ مراد لینا کہ پورے کرۂ ارضی اور روئے زمین پر اللہ کے دین کو غالب کرنا نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی غرض اور مقصد ہے' غلط ہے' بلکہ ﴿لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ﴾ سے مراد صرف جزیرہ نمائے عرب کے ادیان پر دینِ حق کو غالب کر دینا ہے اور یہی درحقیقت رسول اکرم ﷺ کا فرضِ منصبی تھا' جو آپؐ نے ادا فرما دیا۔

یہ بات اگر اس انداز میں کہی جائے کہ اوّلین فریضہ جو بنفس نفیس محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے پورا ہونا تھا وہ جزیرہ نمائے عرب پر دین اسلام کا غلبہ تھا' تو اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ بات تو ہم بھی بیان کرتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک ترتیب و تدریج ہے۔ جیسا کہ ''شہادت علی الناس'' کے ضمن میں اگرچہ حضور ﷺ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کی طرف ہے اور ہر انسان جو قیامت تک اس دنیا میں آئے گا وہ درحقیقت حضور ﷺ کی اُمتِ دعوت میں شامل ہے' لیکن اس شہادت علی الناس کی

ذمہ داری کی ترتیب یہ قائم ہوئی کہ حضور ﷺ نے بنفس نفیس اہل عرب کو تبلیغ فرمائی اور ان میں ایک اُمت برپا کر دی۔ اور اس طرح جو اُمت وجود میں آئی اب تا قیامِ قیامت اس تبلیغ کی ذمہ داری اس کے حوالے کر دی۔ اس طرح شہادت علی الناس کی یہ ذمہ داری نبی اکرم ﷺ کے ذریعے سے دو مرحلوں میں پوری ہوئی۔ پہلے مرحلہ میں حضور ﷺ نے خود اس ذمہ داری کو پورا فرمایا اور اس کی دوسرے مرحلے میں تکمیل بذریعہ اُمت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہوگی۔ یہ بات بالکل دو اور دو چار کی طرح واضح ہے اور اس میں کوئی اشکال نہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ کے فرمان ((بَلِّغُوا عَنِّی وَلَوْ آیَۃً)) میں درحقیقت اسی فرضِ منصبی کی تاکید ہے کہ ہر امتی اس ذمہ داری کی تکمیل میں حصہ لے‘ خواہ ایک ہی آیت کی حد تک لے۔ اور یہاں ’’عَنِّیْ‘‘ کا اصل مفہوم انگریزی زبان میں اردو کی نسبت زیادہ واضح طور پر ’’on my behalf‘‘ کے الفاظ سے ادا ہوتا ہے۔ جو شخص بھی تبلیغ کر رہا ہے‘ جس نے بھی کی ہے‘ وہ معین الدین اجمیریؒ ہوں یا علی ہجویریؒ ہوں‘ جو بھی اللہ تعالیٰ کے اس پیغام کو لے کر کہیں بھی گیا ہے تو یہ درحقیقت تبلیغ محمدیؐ ہے۔ یہ آپ ﷺ ہی کا فیض ہے کہ جو جاری ہے۔ جو کوئی بھی یہ تبلیغ کر رہا ہے وہ آپ ﷺ ہی کے behalf پر کر رہا ہے اور جو کوئی کرے گا وہ بھی آپ ﷺ ہی کے behalf پر کرے گا۔

بالکل یہی ترتیب و تدریج ’’اظھارُ دینِ الحقّ علی الدِّینِ کُلِّہٖ‘‘ میں ہے کہ حضور ﷺ نے جزیرہ نمائے عرب پر دین کو غالب کر دیا اور اس حد تک غلبہ دین کی تکمیل ہوگئی۔ اب اس عمل کو آخری مرحلے اور آخری درجے تک پہنچانا اُمت کی ذمہ داری ہے‘ لیکن اس ضمن میں اُمت کے ہاتھوں جو کچھ ہوگا وہ بھی اصل میں حضور ﷺ ہی کا فیض ہے۔ لہٰذا اس تدریج کو اگر یہاں بیان کیا جائے تو قطعاً کوئی حرج نہیں ہے‘ لیکن اگر اس معاملے کو محدود کر دیا جائے تو یہ غلط ہوگا۔

دراصل ان حضرات نے اصل ٹھوکر سورۃ الجمعۃ میں وارد الفاظ ﴿وَّاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ﴾ کا مفہوم سمجھنے میں کھائی ہے۔ سورۃ الجمعۃ کی دوسری آیت یوں ہے:
﴿ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ ......﴾ ’’وہی ہے (اللہ) جس نے اٹھایا

امیین میں سے ایک رسول انہی میں سے''۔ اور اگلی آیت میں عطف آتا ہے:
﴿وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ﴾ ''اور دوسرے انہی میں سے جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے۔'' ان حضرات نے یہ رائے قائم کر لی کہ ''اٰخَرِیْنَ'' سے مراد بھی عرب ہی کے لوگ ہیں کہ جو اس آیت کے نزول تک ایمان نہیں لائے تھے' بعد میں ایمان لائے۔

''آخَرِیْنَ'' کے اس مفہوم سے ہمیں اختلاف ہے' کیونکہ اولاً تو یہ بات اس کلام کی عظمت کے منافی ہے' اس لئے کہ یہاں عطف جس اہتمام سے لایا جا رہا ہے یہ اس کے ساتھ مناسبت رکھنے والی بات نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے بارے میں ہمارے پاس ایک صحیح حدیثِ مرفوع موجود ہے۔ قرآن مجید کے بہت سے مقامات ایسے ہیں کہ اُن کے بارے میں حضور ﷺ سے سوال کیا گیا اور آپؐ نے اس کا جواب ارشاد فرمایا۔ اب رسول اللہ ﷺ کی وضاحت کے بعد بھی کسی اور طرف دیکھنا اور اِدھر اُدھر جھانکنا تو درحقیقت حدیثِ نبویؐ سے اعراض کی صورت ہو جائے گی۔ اس لئے کہ قرآن مجید کے اجمال کی تفصیل اور قرآن مجید میں اگر کہیں وضاحت مطلوب ہے تو اس کی توضیح اور تبیین بھی درحقیقت فرضِ منصبی ہے محمد رسول اللہ ﷺ کا۔ چنانچہ قرآن کے کسی مقام کی وضاحت میں جب ہمیں رسول اللہ ﷺ کا کوئی قول مل جاتا ہے تو دیگر اقوال کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔ مثال کے طور پر حروفِ مقطعات کے بارے میں اگر ہمیں حضور ﷺ سے کوئی مرفوع قول مل جائے تو ہمیں اِس وادی اور اُس وادی میں سرگردانی کی کوئی احتیاج نہیں۔ حروفِ مقطعات کے ضمن میں مَیں نے بارہا کہا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول ہمیں ملتا ہے لیکن مرفوع نہیں ہے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ ان کا اپنا ایک وجدانی اور ذوقی خیال ہے' لہٰذا اُمت میں سے کسی نے چاہا تو قبول کیا' کسی نے چاہا تو قبول نہیں کیا۔ لیکن اگر مرفوع قول ہوتا کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ ہمارے لئے اسے قبول کرنے کے سوا قطعاً کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ بلکہ اگر کوئی شخص قولِ رسولؐ کی موجودگی میں کسی اور قول کی طرف التفات کرتا ہے یا اپنی رائے ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ نبی اکرم ﷺ کے

مقام و مرتبہ سے آگاہ نہیں ہے۔ بدقسمتی سے اس معاملہ میں ان صاحب سے یہی ہوا۔

حضور ﷺ کی متفق علیہ مرفوع حدیث موجود ہے' حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ ''اٰخَرِیۡنَ مِنۡھُمۡ '' کون ہیں؟ اسی محفل میں حضرت سلمان فارسیؓ موجود تھے' آپؐ نے ان کی طرف اشارہ فرمایا۔ یعنی ''اس کی قوم''۔ اور پھر آپؐ نے فرمایا کہ ایمان اگر ثریا پر بھی ہوگا تو اس کی قوم کا کوئی فرد وہاں سے بھی لے آئے گا۔ ایک روایت میں ''ایمان'' کی جگہ ''علم'' کا لفظ ہے۔ اور اس سے مراد صرف ایرانی قوم نہیں' بلکہ یوں سمجھئے کہ حضور ﷺ نے آریائی نسل کے خاص وصف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آریائی نسل میں علم و حکمت' فلسفہ اور منطق کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ آریائی نسل یونان' ایران اور ہندوستان میں آباد ہوئی اور دنیا میں علم اور فلسفہ و حکمت کے یہی تین عظیم مراکز رہے ہیں۔ فلسفہ و منطق' مسائل کی گہرائی میں جانا' بال کی کھال اُتارنا اور حقیقت تک اپنی عقل کے ذریعے سے پہنچنے کی کوشش کرنا آریائی نسل کا ایک خصوصی وصف اور ان کے مزاج کا جزوِ لاینفک ہے۔ اور جب ﴿اٰخَرِیۡنَ مِنۡھُمۡ ﴾ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی صراحت موجود ہے تو اس کے بعد اب اس کی کوئی اور توجیہہ کرنا درست نہیں ہے' بلکہ یہ رسول اللہ ﷺ کے قول کا استخفاف ہے۔

اس کے علاوہ ان صاحب نے جو ستم ڈھایا ہے اس کو میں تحریف فی الترجمہ کہوں گا۔ میرے نزدیک یہ قرآن مجید میں تحریف کے ہم وزن بات ہے۔ اس سے پہلے یہ ہوتا رہا ہے کہ قرآن مجید کی کسی آیت کے مفہوم میں اگر مترجم نے یہ سمجھا کہ کچھ الفاظ مقدر ہیں تو بریکٹ میں ان کو شامل کر دیا جاتا ہے۔ یہ کام مولانا ابوالکلام آزاد نے کثرت سے کیا ہے۔ اس سے پہلے کے تراجم میں ہمیں یہ چیزیں نہیں ملتیں۔ جس دور میں یہ ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ قرآن مجید کا لفظی ترجمہ کیا جائے اُس وقت احتیاط کی وہ انتہا تھی کہ ہر لفظ کے نیچے اس کا ترجمہ آئے' چاہے اردو میں جملے کی ترکیب کا حق ادا نہ ہو' تقدیم و تاخیر ہو جائے' کوئی پرواہ نہیں' لیکن قرآنی الفاظ کی ترتیب برقرار رہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کا لفظی ہی نہیں لفظ بلفظ ترجمہ کیا جاتا تا کہ مفہوم میں کسی اونچ نیچ کی کوئی ذمہ داری مترجم پر نہ آئے۔ پھر ایک رجحان یہ آیا کہ ترجمہ کو بامحاورہ کرنے کی کوشش کی

جائے‘ چاہے الفاظ میں کچھ تقدیم و تاخیر ہو جائے‘ لیکن پھر بھی التزام کیا گیا کہ لفظی ترجمہ ہو۔ پھر بیسویں صدی کے تراجم میں ایک نیا ذوق پیدا ہوا کہ ایسا ترجمہ ہو جس کو پڑھ کر انسان اس کے مفہوم کو پوری طرح سمجھ لے۔ لہٰذا اس میں کچھ اضافے قوسین (بریکٹ) میں کرنے کا آغاز کیا گیا۔ بریکٹ میں اضافہ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ الفاظ قرآن کے متن میں نہیں ہیں‘ لیکن مترجم کے نزدیک ان الفاظ کے اضافے سے اس آیت کا مفہوم رواں بن جاتا ہے اور بات واضح ہو جاتی ہے۔ اس کا آغاز مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا فتح محمد جالندھریؒ کے تراجم میں بھی قوسین (Brackets) کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی توجیہات و تاویلات کو بھی ترجمہ میں شامل کیا ہے‘ مگر قوسین کے اندر ___ لیکن آج یہ غضب ڈھایا گیا ہے کہ ﴿ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ ﴾ کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: ''تاکہ اسے عرب کے تمام ادیان پر غالب کر دے۔'' اور اپنے اس اضافے کو بغیر بریکٹس کے باضابطہ متن کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت میرے نزدیک نہ صرف بہت بڑی جسارت اور گمراہی ہے‘ بلکہ تحریف فی القرآن کے مساوی ہے۔ آپ ایک آیت کا جو مفہوم سمجھتے ہیں آپ کا حق ہے کہ اسے بیان کریں۔ اس کی بہترین شکل تو یہ ہے کہ آپ اپنی وضاحت حواشی میں بیان کریں۔ مزید اضافہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو بریکٹس میں کریں۔ جو چیز قرآن کے متن میں سرے سے موجود ہی نہیں‘ وہ آپ کا اپنا ذہن و فکر ہے‘ وہ ایک تاویل ہے جو آپ کے سامنے آئی ہے‘ اسے قرآن کے متن میں شامل کر دینا بہت بڑی زیادتی ہے۔

اس طرزِ عمل کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان کسی سبب سے کسی شے کی مخالفت پر کمر کس لے تو یہ چیز اسے اندھا بہرا بنا دیتی ہے۔ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا ہے: ((حُبُّکَ الشَّیْءَ یُعْمِیْ وَیُصِمُّ)) (ابوداؤد و مسند احمد) ''تیرا کسی چیز سے محبت کرنا تجھے اندھا بہرا بنا دیتا ہے۔'' اسی طرح مخالفت‘ دشمنی اور بغض و عناد بھی انسان کو اندھا بہرا کر دیتا ہے۔ ان آیات کے بارے میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کا موقف جو انہوں نے ''ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء'' میں بیان کیا ہے‘ ہم میثاق (اپریل

۱۹۸۶ء) میں شائع کر چکے ہیں۔ کسی کو چند عربی اشعار از بر ہوں اور جاہلی شاعری سے کچھ مناسبت ہو تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ شاہ ولی اللہؒ سے بھی آگے نکل گیا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ قرآن کی اس عبارت کی صرفی ونحوی ترکیب شاہ ولی اللہ کی نظروں سے بھی اوجھل رہی۔ یہی درحقیقت انسان کی طبیعت کا وہ نشوز ہے جس سے پھر فتنے جنم لیتے ہیں۔ اسی سے اُمت کے اندر طرح طرح کی گمراہیاں پیدا ہوئیں اور پھلی پھولیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ (آمین)

اس نشست میں مَیں اس آیۂ مبارکہ پر کچھ عرض نہیں کر رہا ہوں۔ اس پر میں ''نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت'' میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں اور مجھے اس پر پورا انشراح ہے۔ اس آیت کے جو مختلف ترجمے کئے گئے ہیں میں نے ان سب کو پیش نظر رکھا ہے اور لِیُظْھِرَہٗ کی ضمیر فاعلی اور ''ہٗ'' کی ضمیر مفعولی کے تمام امکانات کو زیر بحث لا کر یہ ثابت کیا ہے کہ کسی بھی طرح مراد میں قطعاً کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ لِیُظْھِرَ کا فاعل رسول ہو یا اللہ، نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے۔ ''تا کہ رسول غالب کر دے دین حق کو'' مفہوم لیا جائے یا ''اللہ غالب کر دے اپنے دین کو'' اس سے نتیجے میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ فاعل حقیقی تو اللہ ہی ہے، لیکن اس کے لئے محنت انسان کو کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ مشقت محمد رسول اللہ ﷺ نے جھیلی ہے، فاقے آپؐ کو برداشت کرنے پڑے ہیں، شعب بنی ہاشم کی تین سال کی اسیری کے تمام شدائد ومصائب کا معاملہ حضور ﷺ کے ساتھ ہوا ہے۔ آپؐ کو اپنے جسم اطہر پر پتھراؤ برداشت کرنا پڑا ہے۔ صحابہ کرامؓ کو اپنی جانیں دینی پڑی ہیں، مگر فاعل حقیقی اللہ ہی ہے، از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی﴾ عالم واقعہ میں تو حضور ﷺ نے مٹھی بھر کر کنکریاں پھینکی تھیں لیکن اللہ نے فرمایا کہ آپؐ نے نہیں، ہم نے پھینکی ہیں۔ گویا ع ''ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مؤمن کا ہاتھ!'' تو نتیجہ کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ رازقِ حقیقی یقیناً اللہ ہے، اگرچہ رزق کے لئے محنت ومشقت اور معاشی بھاگ دوڑ انسان کرتا ہے۔ اسی طرح ''اظھارُ دینِ الحق علی الدِّینِ کُلِّہٖ'' کا فاعل حقیقی اللہ ہے جبکہ اس کے لئے محنت ومشقت کرنی پڑی ہے ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ'' کو —

صلی اللہ علیہ وسلم و رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

کسی نے کہا کہ ہٗ کی ضمیر مفعولی حضور ﷺ کی طرف جاتی ہے ''تا کہ اللہ غالب کردے اپنے رسول کو''۔ نتیجہ پھر بھی وہی آئے گا' اس لئے کہ رسولؐ کے غلبے کا مطلب دین ہی کا غلبہ تھا۔ رسولؐ نے کوئی اپنی سلطنت کی بنیاد نہیں رکھی' کوئی اپنے نام سے حکومت قائم نہیں کی' بلکہ رسول اللہ ﷺ کا معاملہ تو دوسری انتہا پر نظر آتا ہے کہ جب عام مسلمانوں کے گھروں میں بھی کشادگی و فراوانی آ چکی تھی' تنگی ختم ہو چکی تھی' اُس وقت بھی آپؐ نے اپنا چولہا ٹھنڈا رکھا ہے۔ جب تمام مسلمانوں کے ہاں خدام اور کنیزیں تھیں اُس وقت بھی اپنی لختِ جگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کوئی کنیز یا غلام عطا نہیں کیا۔ تو وہ غلبہ محمد ﷺ کا اس معنی میں نہیں تھا کہ کسی شخصیت کا غلبہ تھا' بلکہ وہ دین کا غلبہ تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب حضرات میرے مقالے ''نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت'' کا مطالعہ ضرور کریں' تا کہ یہ جو فتنے اٹھ رہے ہیں اور ہم نے اپنی اجتماعی جدوجہد کا جو ہدف معین کیا ہے ''اقامت دین'' اور ''اظہارُ دینِ الحقّ علی الدِّینِ کُلِّہٖ'' اس کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں تو ہم کہیں لاعلمی میں اور اپنی کم فہمی کے باعث یا ان حقائق کے واضح نہ رہنے کے باعث کسی ایسی تحریک یا کوشش سے متاثر نہ ہو جائیں۔

اب اصل میں اس آیۂ مبارکہ کا سورۃ الفتح کی آخری آیت سے جو ربط و تعلق ہے اس درس میں اس پر گفتگو ہوگی۔ اقامت دین اور غلبہ دین کی جو یہ جدوجہد ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ یہ جدوجہد کس نے کی؟ اور وہ لوگ کن اوصاف کے حامل تھے؟ یہ اس آخری آیت کا مضمون ہے اور ہمارے اِس منتخب نصاب نمبر۲ کے ساتھ منتخب نصاب نمبر ایک کا link اب یہاں سے قائم ہو رہا ہے۔

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ﴾ پہلے تو اس کی ترکیب کے بارے میں جو اختلاف ہے اس کو سمجھ لیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' ایک مکمل جملہ ہے اور ''وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ'' سے ایک جملہ مستانفہ شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی یہاں سے

ایک نئی بات کا آغاز ہو رہا ہے اور اس جملے کا سابقہ جملے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ اس صورت میں ترجمہ ہوگا: ''محمد اللہ کے رسول ہیں''۔ یہ جملہ اسمیہ خبریہ ہے۔ ''محمد'' مبتدا اور ''رسول اللہ'' مضاف' مضاف الیہ مل کر خبر ہوگئی' جملہ کامل ہوگیا۔ اگلے الفاظ سے نیا جملہ شروع ہوگا: ''اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں......'' دوسری رائے کی رو سے ترجمہ ہوگا: ''اللہ کے رسول محمدؐ اور وہ لوگ جو اُن کے ساتھ ہیں''۔ معطوف اور معطوف علیہ جمع ہو کر مبتدا بنیں گے' جبکہ خبر بعد میں آئے گی اور وہ ہے ''اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ''۔ خبر اوّل ہوگی ''اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ'' اور خبر دوم ہوگی ''رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ'' اور یہ سلسلہ آگے چلے گا۔ تو یہ پورا معاملہ خبر کا ہو جائے گا۔ یعنی اللہ کے رسول محمد (ﷺ) اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں ان کے یہ یہ اوصاف ہیں۔

اگر پہلی رائے قبول کی جائے تو یوں بات ہوگی کہ جہاں تک تعلق ہے محمد ﷺ کا وہ تو اللہ کے رسول ہیں ہی۔ گویا کہ وہ تو تمام کمال و محاسن کے جامع ہیں' ان کے بارے میں تو کچھ کہنے کی احتیاج ہے ہی نہیں' آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ ان کے خصا ' اوصاف' محاسن اور کمالات از خود روشن ہیں۔ مزید ان کے کسی ذکر کی حاجت نہیں' صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ''محمد اللہ کے رسول ہیں''۔ جیسے ہم اپنے محاورے میں کہتے ہیں ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں''۔ تو گویا کہ ایک جملے میں وہ ساری بات آ گئی اور جتنی بھی ان کی مدح ہو سکتی تھی وہ اس میں ہوگئی کہ ''محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔'' اب اس پر مزید کسی اور شے کے اضافے کی کوئی احتیاج نہیں۔ اب جو اوصاف بیان ہو رہے ہیں ان کے حامل حضور ﷺ کے ساتھی ہیں۔ یہ آپؐ کی جماعت کے افراد کے اوصاف ہیں جن کو یہاں پر بیان کیا جا رہا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب تمام کمال و محاسن محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی میں جمع ہیں تو یہ اوصاف بھی بدرجہ اَتم' بدرجہ کمال آپ کے اندر بھی موجود ہیں۔ اس اعتبار سے اگر ان دونوں کو مبتدا بنا لیا جائے تو خبر میں بھی دونوں شریک ہو جائیں گے' لیکن ہمارے لئے عملی اعتبار سے جو اہم تر پہلو ہے وہ آگے ہے کہ جو حضور ﷺ کے ساتھی ہیں اُن کے اوصاف کیا ہیں!

آگے بڑھنے سے پہلے نوٹ کیجئے کہ یہاں اقامت دین کے لئے قائم ہونے

والی جماعت کی ہیئت ترکیبی کی طرف بھی ایک اشارہ موجود ہے۔ اس کا تعلق سورۃ الصّف کی آخری آیت سے جڑتا ہے کہ وہ جمعیت اس طور سے فراہم ہوتی ہے کہ کوئی داعی پکارتا ہے: ''مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ ؟'' اور دوسرے اس پکار پر لبیک کہتے ہوئے یہ اقرار کرتے ہیں: ''نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ !'' یہ اس جماعت کی ترکیب اور اس کا synthesis ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ پہلے داعیانِ حق انبیاء و رُسل تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ''مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ'' کی ندا لگائی ﴿کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ﴾ اب یہاں اُس کو بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آج یہ کام محمد رسول اللہ ﷺ کر رہے ہیں۔ وہ اللہ کے رسول ہیں' دین کو غالب کرنا اصلاً ان کا فرض منصبی ہے۔ جیسے دین کی تبلیغ اصلاً ان کا فرضِ منصبی ہے' اُمتی جو بھی اس میں حصّہ لے رہا ہے وہ آپؐ کی جانب سے (on his behalf) لے رہا ہے اور اس کام میں آپؐ کا مددگار بنا ہے۔ آپؐ کے سب ساتھی اس ذمہ داری کی ادائیگی میں آپؐ کے اعوان و انصار بنے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں میں نے بارہا عرض کیا ہے کہ حضور ﷺ پر ایمان لانے کے بعد وہ اس پیغام کو آگے پہنچانے پر جس طرح کمر بستہ ہوئے اس کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ عشرۂ مبشرہ میں سے چھ وہ ہیں جو حضرت ابوبکرؓ کی دعوت و تبلیغ سے اسلام لائے۔ لیکن یہ ذمہ داری اصلاً محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے جبکہ آپؐ کے ساتھی درحقیقت آپؐ کی جانب سے اس فرض کو ادا کر رہے ہیں۔ اسی طرح غلبۂ دین کی ذمہ داری اصلاً تو محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے اور جو حضرات بھی آپؐ کے ساتھ آئے ہیں ﴿وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ﴾ وہ آپؐ کے اعوان و انصار ہیں' آپؐ کے مددگار ہیں' آپؐ کے دست و بازو بنے ہیں۔

اس جماعت میں حضور ﷺ کی ایک تو وہ حیثیت ہے کہ جو تمام حیثیتوں سے بالاتر ہے۔ یعنی آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ لیکن اب یہاں ایک اور نسبت قائم ہو گئی اور وہ امیر اور مامور کی نسبت ہے۔ انفرادی طور پر نبی اکرم ﷺ کی صحابہ کرامؓ کے ساتھ بہت سی نسبتیں قائم ہوئیں۔ جیسے حضور ﷺ کے ساتھ ایک نسبت حضرت عائشہؓ کی ہے'

یہ شوہر اور بیوی کی نسبت ہے۔ ایک نسبت آپؐ کی حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ہے' یہ داماد اور خسر کی نسبت ہے۔ مختلف نسبتیں حضرت علیؓ سے ہیں' داماد اور خسر کی نسبت بھی ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی آپؐ کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو نسبتیں قائم ہوئیں وہ یہ ہیں کہ حضور ﷺ امیر ہیں اور تمام صحابہؓ مامور ہیں' حضور ﷺ حاکم ہیں اور باقی سب لوگ آپؐ کا حکم تسلیم کر رہے ہیں' حضور ﷺ اس ریاست کے چیف جسٹس ہیں' اور تمام صحابہؓ اپنے نزاعات آپؐ کے حضور پیش کرتے ہیں۔ اگر دو مسلمان کوئی مقدمہ لے کر آپؐ کی عدالت میں پیش ہوئے ہیں تو اس وقت ان دونوں کی آپس میں نسبت مدعی اور مدعا علیہ کی ہے' جبکہ دونوں کے لئے منصف' جج اور قاضی کی حیثیت آپؐ کی ہے۔ تو یہ اضافی نسبتیں تھیں جو آپؐ کی صحابہ کرامؓ کے ساتھ قائم ہوئیں۔ اسی طرح ایک نسبت اس جماعت میں امیر اور مامور کی ہے جو آپؐ اور صحابہؓ کے مابین قائم ہوئی۔ لیکن یہ کہ اس کا اصل synthesis یہ ہے: ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ''۔ اور اس کا ربط پھر ذہن میں قائم کر لیجئے ''مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ ؟'' اور ''نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ!'' کے ساتھ۔

اقامت دین کی جدوجہد کے لئے آئندہ جو بھی جماعت قائم ہوگی اس کے لئے بنیاد ہمیں قرآن و سنت ہی سے اخذ کرنی ہے۔ اس لئے کہ ہمیں اتباع تو آپؐ ہی کا کرنا ہے' پیروی آپؐ ہی کی کرنی ہے' اور حتی الامکان زیادہ سے زیادہ جتنی پیروی کی جا سکے کرنی ہے۔ البتہ ایک بات بالکل واضح ہے کہ اب جو کوئی بھی اس جدوجہد کے لئے کھڑا ہوگا وہ داعی تو ہوگا نبی نہیں ہوگا۔ اس حیثیت کو ہمیشہ ذہن میں رکھا جائے۔ وہ سلسلہ آپؐ پر ختم ہو چکا ہے۔ حضور ﷺ کسی غزوہ کے لئے تشریف لے جا رہے تھے اور حضرت علیؓ کو آپؐ نے اپنے نائب یا خلیفہ کے طور پر مدینے میں مقیم رہنے کا حکم دیا۔ اب جنگ پیش آ رہی ہو' صحابہؓ شرکت کے لئے جا رہے ہوں' جان کی بازی لگانے کا موقع مل رہا ہو اور حضرت علیؓ مدینہ میں رہیں' یہ بات آپؓ کے مزاج سے مطابقت نہ رکھتی تھی۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے حضور ﷺ سے شکوہ کیا کہ آپؐ مجھے یہاں خواتین کے ساتھ چھوڑ کر جا رہے ہیں! اس پر آپ ﷺ نے دلجوئی کے لئے فرمایا کہ

کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ تمہاری میرے ساتھ وہی نسبت ہو جو موسیٰؑ کے ساتھ ہارونؑ کی تھی؟ سوائے اس فرق کے کہ نبوت مجھ پر ختم ہو چکی ہے' وحی کا معاملہ بند ہو چکا ہے۔ یعنی اس تشبیہ سے کہیں یہ مغالطہ نہ ہو جائے کہ حضرت علیؓ حضرت ہارونؑ کی طرح نبی بھی ہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے ساتھ ہی یہ صراحت فرما دی کہ مبادا لوگ اس کو حضرت علیؓ کی نبوت کے لئے دلیل بنالیں۔ اگرچہ لوگوں نے تو حضرت علیؓ کو خدا تک بنالیا' لیکن اگر حضور ﷺ نے یہ صراحت نہ فرمائی ہوتی تو کچھ لوگوں کے لئے اس کا امکان بھی پیدا ہو جاتا کہ اس قولِ رسولؐ کی بنیاد پر ان کی نبوت ثابت کر دیں۔ چنانچہ ایک بات ہمیشہ مستحضر رہنی چاہئے کہ معصومیت ختم ہو چکی' وحی کا دروازہ بند ہو چکا' نبوت کا سلسلہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ختم ہو چکا۔ البتہ اقامت دین کے لئے جو جماعت یا تنظیم قائم ہوگی اس کے لئے اگر وہی مسنون نسبت قائم نہ کی گئی تو وہ ''علیٰ منہاج النبوۃ'' نہیں ہوگی' وہ حضور ﷺ کے نقش قدم پر نہیں ہوگی اور اس کا خاکہ ہم نے گویا کہیں اور سے مستعار لیا ہوگا۔ جبکہ ہمیں ہر چیز کے اندر رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنی ہے۔ اتباعِ رسولؐ صرف عبادات میں ہی نہیں ہے بلکہ پوری زندگی میں ہے۔ اقامت دین کی جدوجہد جو کہ دین کی بلند ترین منزل ہے' اس کے لئے بھی سارا نقشہ وہیں سے لینا ہے۔ لیکن یہ فرق ہمیشہ ملحوظ رہے کہ اگر کہیں کسی شخصیت کے بارے میں کوئی مبالغہ' کسی کے بارے میں عقیدت میں کوئی غلو یا کسی کے آداب کو ملحوظ رکھنے میں حد اعتدال سے تجاوز ہو جائے گا تو شخصیت پرستی کی بنیاد پڑ جائے گی اور اس طرح ایک نیا فتنہ شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ اس احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہمیں باقی pattern وہیں سے لینا ہے' سارا نقشہ وہیں سے اخذ کرنا ہے۔

اقامت دین کی جدوجہد کے لئے قائم ہونے والی جماعت کی نوعیت کے ضمن میں ہمیں قرآن وسنت سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ کوئی ایک شخص داعی کی حیثیت سے اٹھتا ہے اور وہ ایک کام کا بیڑا اٹھاتا ہے' اللہ اس کو ہمت دیتا ہے اور اس کے اندر ایک جذبہ ابھارتا ہے۔ اس لئے کہ ہر چیز کا فاعل حقیقی اور مؤثر حقیقی تو اللہ ہی ہے۔ کسی کے دل میں اگر ارادہ پیدا ہوا ہے تو وہ بھی اللہ کا عطا کردہ ہے۔ پھر یہ کہ ایک تو منزل ہے جس کا

قصد کیا جا رہا ہے کہ جانا کہاں ہے اور ایک یہ کہ وہ طریق' وہ راستہ کون سا ہے جو ہمیں اس منزل تک پہنچائے گا۔ ان دونوں چیزوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ اگر کسی کو انشراح عطا فرماتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ ''جا ایں جاست'' بات یہی ہے' حق یہ ہے' تو اس کو جو انشراح ہوا ہے وہی کچھ ذہنوں اور کچھ سینوں کے اندر منتقل ہوگا اور وہ لوگ اب اس کے دست و بازو بنیں گے' اس کی پکار پر لبیک کہیں گے' اس کے ساتھ جڑیں گے۔ ''جوڑ'' اور ''جڑنا'' کے الفاظ ہمارے تبلیغی بھائی بالکل صحیح معنیٰ میں استعمال کرتے ہیں۔ اب اس ایک فرد کے ساتھ دوسرے افراد کے جڑنے سے اس کے گرد دائرے بنتے چلے جائیں گے۔ پہلے چار چھ آدمی آئے' پھر اس کے بعد اور بڑھے' پھر اور بڑھے۔

یہ ہے اصل میں وہ فطری ترتیب جو ہمیں انبیاء و رُسل کی دعوت میں ملتی ہے' جبکہ اس کے برعکس اِس دور کا تصور یہ ہے کہ کچھ لوگ مل جل کر ایک جماعت بنائیں۔ ہمارے ہاں انجمنیں اسی طرح بنتی ہیں۔ انجمنوں کے لئے کوئی داعی نہیں ہوا کرتا' بلکہ کوئی وقت کا تقاضا ہوتا ہے' کوئی ایک وقتی ضرورت ہوتی ہے جس کے تحت انجمن ظہور میں آ جاتی ہے۔ انگریز کے زمانے میں محسوس کیا گیا کہ ہندو تعلیم میں ہم سے آگے نکل گیا ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں تو اختلافِ رائے ہو گیا تھا' ہمارے علمائے کرام نے انگریزی پڑھنے کو اور انگریزی علوم حاصل کرنے کو شجر ممنوعہ قرار دیا تھا' لہٰذا مسلمان پیچھے رہ گئے اور ہندو اس دوڑ میں آگے نکل گئے' انگریز کے دربار میں انہیں رسائی حاصل ہو گئی۔ اُس وقت ہر اعتبار سے محسوس ہونے لگا کہ اگر تعلیم کے میدان میں مسلمان کا یہی حال رہا تو پھر وہ صرف بلّے دار یا بہشتی بن سکیں گے اور معاشرے کے اندر بالکل پسماندہ ہو کر رہ جائیں گے۔ چنانچہ اجتماعی سطح پر ایک جذبہ ابھرا اور پیش نظر تقاضے کی بنیاد پر کچھ لوگوں نے ''انجمن حمایت اسلام'' بنالی جس کے تحت تعلیمی ادارے قائم کئے گئے۔ اسی طرح کئی اور انجمنیں قائم ہوئیں' کسی کے تحت کوئی ہائی سکول قائم ہو گیا' کسی کے تحت کوئی کالج بن گیا' کوئی کالج بن کر یونیورسٹی کے درجے کو پہنچ گیا۔ وہ درحقیقت ایک جذبہ تھا' وقت کی ایک ضرورت تھی جسے بہت سے لوگوں نے بیک وقت

محسوس کیا اور بہت سے لوگوں نے مل جل کر اپنے آپ کو ایک انجمن کی صورت میں منظم کرلیا۔ اس میں کسی فردِ واحد کی دعوت' اس کا فکر' اس کا انشراح' اس کا پکار بلند کرنا اصلاً فیصلہ کن نہیں تھا۔ تو انجمنیں بھی بلا شبہ ایک طرح کی ہیئت تنظیمی ہوتی ہیں' ان میں سب لوگ مساوی حیثیت سے شریک ہوتے ہیں' پھر ووٹ کی بنیاد پر کسی کو صدر بناتے ہیں' ووٹ کی بنیاد پر مجلس منتظمہ معین کرتے ہیں اور ان کے مابین حدود و اختیارات اور حقوق میں توازن پیدا کیا جاتا ہے' اس طرح یہ گاڑی چلتی ہے۔

لیکن اقامت دین کی جدوجہد کے لئے قائم جماعت کی ہیئت تشکیلی یہ نہیں ہے' بلکہ اس میں اصل معاملہ داعی و مدعو کا ہے' یعنی ''مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ '' کی ندا لگانے والے کا اور جو اس کی ندا پر لبیک کہے اس کا ہے۔ وہ شخص کہ جو آگے بڑھا ہے' جس نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور وہ لوگ کہ جو اس کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اس کے ساتھی بنے ہیں ان کے آپس میں جڑنے سے وہ جماعت وجود میں آتی ہے۔ تو یہ ایک اہم نکتہ ہے جو قرآن کے ان دو مقامات کے حوالے سے پوری طرح واضح ہو کر ذہن نشین رہنا چاہئے۔ ایک سورۃ الصّف کی آخری آیت: ﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا اَنْصَارَ اللّٰہِ کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ ﴾ اور دوسری سورۃ الفتح کی زیر نظر آیت ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ ﴾ اس جماعت کی جو تشکیل ہوئی ہے' اس کی جو ہیئت ترکیبی ہے وہ یہی ہے کہ ''محمد اللہ کے رسول اور وہ لوگ جو اُن کے ساتھ ہیں'' جنہوں نے آپ ؐ کی پکار پر لبیک کہا ہے اور حاضر ہو گئے ہیں۔

ان کا پہلا وصف یہ ہے: ﴿اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ ﴾ ''کفار پر بہت سخت اور آپس میں رحم دل ہیں۔'' ظاہر ہے کہ جب وہ ایک ہیئت اجتماعی میں شریک ہو گئے تو اب ایک تفریق ہوئی ہے۔ ایک وہ ہیں جو اس ہیئت اجتماعیہ میں شامل ہیں اور ایک وہ ہیں جو شامل نہیں ہیں' تو ان میں حد فاصل قائم ہو گئی۔ پھر یہ کہ جو آ گئے ہیں ان میں بھی حفظ مراتب ہو گا' سب برابر تو نہیں ہوتے۔ ابو بکر صدیق ؓ کا اپنا مقام و مرتبہ ہے' عمر فاروق ؓ کا اپنا مقام و مرتبہ ہے' ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ صحابہ کے

اندر تفضیل تو ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں انبیاء و رُسل کے بارے میں فرمایا گیا:
﴿تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ﴾ ''یہ وہ رسول ہیں کہ بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی''۔ اسی طرح صحابہؓ میں بھی بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ ہمارے ہاں اہل سنت کے نزدیک یہ بات متفق علیہ ہے کہ بالکل چوٹی پر تو چار خلفائے اربعہ ہیں اور ان میں جو ترتیب خلافت ہے یہی ترتیب فضیلت ہے کہ خلیفۂ اوّل تمام صحابہؓ میں افضل ہیں' پھر خلیفۂ ثانی' پھر خلیفۂ ثالث اور پھر خلیفۂ رابع۔ اس کے بعد پھر چھ حضرات عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں۔ ان کے بعد پھر نیچے اتریں گے تو ۳۱۳ اصحابِ بدر ہیں۔ پھر ذرا اور نیچے اتریں تو ۱۴۰۰ یا ۱۸۰۰ اصحاب بیعت رضوان ہیں۔ اس سے پھر ایک سیڑھی نیچے اتریں تو وہ سب لوگ جو فتح سے پہلے ایمان لائے۔ (فتح سے مراد صلح حدیبیہ ہے یا فتح مکہ' اس میں اختلاف ہے) اور پھر اس کے بعد وہ سب صحابہؓ جو فتح کے بعد ایمان لائے۔ اس کے لئے سورۃ الحدید میں نص بھی موجود ہے:

﴿لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا﴾

''تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے۔ ان کا درجہ بہر حال بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے۔''

تو یہ فرقِ مراتب اور حفظِ مراتب ان میں بھی ہے کہ جو ''اَلَّذِیْنَ مَعَهٗ'' میں شامل ہیں۔ وہ اس جماعت کے افراد ہیں' سب محمد ﷺ کے ساتھی ہیں' ان کے لئے علیحدہ علیحدہ کوئی نام بھی نہیں رکھے گئے' ان میں قانون کے درجے میں کوئی درجہ بندی نہیں تھی' جو اپنے جذبہ سے جتنا قریب آ گیا' جس نے جتنی محنت کی' جس نے جتنی قربانیاں دیں' جس نے جتنا زیادہ وقت صرف کیا' جس نے اپنے آپ کو جتنا چمٹا لیا محمد ﷺ سے اتنا ہی وہ قریب ہوتا چلا گیا اور اتنا ہی پھر حضور ﷺ مشوروں میں ان پر زیادہ اعتماد فرمانے لگے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین'' میں رسول اللہ ﷺ کے بہت سے اقوال نقل فرمائے ہیں کہ آپؐ کے کلامِ مبارک میں

یہ انداز بکثرت ملے گا: ((جِئْتُ اَنَا وَاَبُوْبَکْرٍ وَعُمَرُ)) ''میں آیا اور ابوبکرؓ آئے اور عمرؓ آئے۔'' اسی طرح ((ذَھَبْتُ اَنَا وَاَبُوْبَکْرٍ وَعُمَرُ)) ''میںؐ بھی گیا تھا اور ابوبکرؓ اور عمرؓ بھی۔'' چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو دو حضرات ہیں ''صاحبین'' یہ تو گویا ہر وقت سائے کی طرح حضور ﷺ کے ساتھ ہوتے تھے اور جب بھی کوئی مشورہ ہوتا تو اوّلیت انہی کو حاصل ہوتی۔ اسی طرح ایک فطری ترتیب تو وہاں قائم تھی' لیکن کوئی قانونی ترتیب قائم نہیں کی گئی۔ بہرحال ایک حد بندی تو یہ ہوگئی کہ جو آپؐ کے ساتھ نہیں ہیں وہ علیحدہ ہیں اور جو ساتھ ہیں وہ علیحدہ۔

پھر جس طرح ان ساتھ والوں میں درجہ بندی اور حفظ مراتب ہے اسی طرح ''نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد'' کے مصداق آپؐ کی جماعت میں شامل نہیں' جو باہر ہیں وہ بھی سب برابر نہیں ہیں۔ باہر تو ابوطالب اور مطعم بن عدی بھی ہیں' لیکن دونوں شریف لوگ ہیں' حضور ﷺ کی مخالفت نہیں کر رہے' بلکہ تعاون ہی کر رہے ہیں۔ وہ لوگ بھی ابھی ساتھ نہیں آئے تھے کہ جو شعب بنی ہاشم میں پہاڑ کی چوٹی کو عبور کر کے رات کے وقت جا کر کچھ کھانے پینے کا سامان پہنچاتے تھے۔ ان میں حکیم بن حزامؓ ہیں جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔ تو جو باہر ہیں ان میں بھی درجہ بندی ہوگی۔ ایک وہ ہیں جو ساتھ تو نہیں ہیں لیکن معاند اور مخالف بھی نہیں ہیں' دشمن نہیں ہیں' ایذا پر کمر بستہ نہیں ہیں اور ایک وہ ہیں کہ جو مخالفت میں پیش پیش ہیں۔ اب ان میں بھی ہر ایک کا الگ درجہ ہوگا۔ کسی میں رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں سے عناد' بغض اور دشمنی آخری درجے کو پہنچی ہوئی ہے' جیسے ابوجہل اور ابولہب ہیں' چاہے وہ انتہائی قریبی رشتہ دار ہیں۔ ابوجہل کا قبیلہ ایک ہے مگر گھرانہ ایک نہیں ہے' لیکن ابولہب کا تو قبیلہ' گھرانہ اور خاندان وہی ہے۔ اس کا حضور ﷺ کے ساتھ چچا اور بھتیجے کا رشتہ ہے۔ لیکن جس طرح ابوجہل دشمن ہے اتنا ہی ابولہب بھی ہے۔ تو یہ درجہ بندی بھی ذہن میں رکھیں۔ اور اسی کے اعتبار سے اب نسبت بدل جائے گی۔ پہلی چیز جو اِس اجتماعیت کی تقویت کے لئے لازم ہے وہ یہ کہ دلی تعلق کا معیار اب اسی کے مطابق ڈھل

جائے۔ جو اجتماعیت ایک مقصد کے تحت وجود میں آئی ہے اس مقصد کے ساتھ جتنی گہری commitment اور جتنا گہرا دلی تعلق ہے اس کا ظہور ہونا چاہئے۔ اس مقصد کے حوالے سے جو لوگوں میں تقسیم ہوئی ہے اور درجہ بندی ہوئی ہے اس کا عکس اگر اس جماعت میں نظر آئے تب تو درحقیقت ظاہر و باطن اور قول و عمل میں ہم آہنگی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کی اس مقصد کے ساتھ commitment صحیح نہیں ہے۔ آپ دعویٰ ضرور کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں وہ مقصد آپ کے احساسات میں جذب نہیں ہوا اور نہ جس کو یہ مقصد جتنا عزیز ہوا تنا ہی وہ آپ کو عزیز اور محبوب ہونا چاہئے اور جو اس مقصد سے جتنا دور ہے وہ اتنا ہی آپ کے دل سے دور ہونا چاہئے۔

اس ضمن میں یہ بات ذہن میں رکھئے کہ ایک ہمارا ظاہری برتاؤ ہے' اس میں قانون کا معاملہ ہوگا' کون باپ ہے' کون ماں ہے' کون دوسرے درجہ پر ہمارا عزیز ہے اور اس کے کیا حقوق ہیں۔ جیسا کہ والدین کے معاملے میں فرمایا کہ وہ تمہیں شرک پر مجبور کر رہے ہوں تو تمہیں ان کا کہنا نہیں ماننا' لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہ ان کے سارے حقوق ساقط ہو جائیں گے' بلکہ ان کے ساتھ حسن سلوک اسی طرح برقرار رہے گا ﴿وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا﴾۔ اسی طرح بھائیوں کا یا دوسرے رشتہ داروں کا معاملہ ہے کہ ان کے جو بھی حقوق ہیں وہ ادا کئے جائیں۔ خاص طور پر جب معاملہ مسلمانوں کے مابین آ جائے گا تو جو بھی مسلمان کے قانونی حقوق ہیں وہ ادا کرنے ہوں گے۔ اور پھر شریعت میں قرابت دار مسلمان کا حق فائق ہے' وہ جوں کا توں قائم رہے گا۔ لیکن ایک دلی تعلق ہوتا ہے' اس کے مستحق وہ ہیں جو آپ کے ہم مقصد ساتھی ہیں۔ اگر تمہارا قلبی میلان ان لوگوں کی طرف ہے جو اس مقصد میں تمہارے ساتھی نہیں ہیں' جو اس سفر میں تمہارے ہم سفر نہیں ہیں' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پر اس سفر کی قدر و قیمت ہی منکشف نہیں ہوئی' اس کی حیثیت کو تم نے جانا ہی نہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے ﴿مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ 'انہوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسا کہ

اس کی قدر کرنی چاہیے۔''اللہ کا اندازہ نہ کیا جیسا کہ اندازہ کرنا چاہیے۔

اس سارے معاملے کا دارومدار ہمارے value system پر ہوتا ہے کہ کس چیز کی آپ کی نگاہ میں قدر و منزلت ہے' اسی کے اعتبار سے آپ کا رویہ طے پائے گا۔ اگر آپ نے اس کام کی قدر کو سمجھا ہے تو پھر ان لوگوں کی قدر و منزلت آپ کی نگاہ میں ہوگی اور ان سے محبت ہوگی جو آپ کے اس کام میں شریک ہیں' آپ کے دست و بازو ہیں' آپ کے ساتھ لگے ہوئے ہیں' جن کو آپ رفیق' کامریڈ' colleague' ہم سفر اور ہم مقصد ساتھی کہتے ہیں' اور آپ کی محبت ان کے ساتھ نہیں ہوگی جو آپ کے ساتھ نہیں ہیں' جو اس مقصد کے دشمن ہیں' جو اس کے ساتھ بغض و عناد رکھتے ہیں' جو اس کے راستے میں روڑے اٹکاتے ہیں' اب ان کے ساتھ تو کسی درجے میں مودت کا معاملہ بھی نہیں رہے گا' بلکہ حقیقت کے اعتبار سے ان کے ساتھ potentially دشمنی کی نسبت قائم ہوگی۔ اس لئے کہ دوستی اور دشمنی کا معیار تو اللہ تعالیٰ ہے۔ چنانچہ جو اللہ کا دشمن ہے وہ ہمارا دشمن ہے' جو اللہ کے دین کا دشمن ہے وہ ہمارا دشمن ہے' چاہے وہ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتا ہو' چاہے وہ ہمارا بھائی یا بیٹا ہو' خواہ وہ ہمارے عزیز رشتہ دار ہوں۔ تو جہاں تک وہ لوگ ہیں کہ جو مخالفت پر کمر کس چکے ہوں ان کے باب میں ''اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ '' کا معاملہ ہوگا۔ یعنی بہت بھاری ہیں ان پر جو انکار کرنے والے ہیں' معاند ہیں۔

یہ وضاحت اس لئے کر رہا ہوں کہ سورۃ الممتحنہ میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان غیر مسلموں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے نہیں روکتا کہ جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمہیں گھروں سے نہیں نکالا' انہوں نے تمہارے خلاف کوئی جتھا بندی نہیں کی' ان کے ساتھ حسن سلوک ہو تو کوئی حرج نہیں۔ البتہ جن سے تمہیں شدت کے ساتھ روکتا ہے ان کی دوستی اور محبت سے باز آ جانا ایمان کا لازمی و بنیادی تقاضا ہے' اگر اس کو بھی پورا نہیں کرتے تو اصل میں تمہارا ایمان مشکوک ہو جائے گا۔ تو ان لوگوں کے ساتھ محبت' اخوت اور دوستی کا کوئی رشتہ برقرار

رہنا ایمان کے منافی ہے کہ جو دین کے خلاف جتھا بندی اور محاذ آرائی کر رہے ہیں' جو جنگ میں تمہارے مدمقابل بن کر آئے ہیں۔ اب اس بنا پر کہ تمہارے ان سے خاندانی روابط تھے' یا تم کبھی ان کے حلیف رہے ہو' یا ان سے کوئی خونی رشتہ ہے' ان سے تمہاری محبت قائم رہی تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ تمہاری محبت سچی نہیں ہے۔ تو یہ فرق و تفاوت قرآن نے کیا ہے۔ یہاں چونکہ اجمال ہے اس لئے وہ فرق یہاں بیان نہیں ہوا تو میں نے مناسب سمجھا کہ اس کو دوسرے مقام کے حوالے سے کھول کر بیان کر دوں کہ یہ صفات ایک دوسرے کا عکس ہیں: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ﴾ کہ جو بھی مخالفین و معاندین ہیں ان پر بہت بھاری ہیں اور جو اپنے شریک سفر ہم مقصد ساتھی ہیں ان کے لئے بہت نرم ہیں۔

بھاری یا سخت ہونے کا مطلب یہ نہ سمجھئے کہ ہر وقت ان کے درپئے آزار رہنا اور ہر وقت ان کی جڑ کاٹتے رہنا۔ بھاری ہونا اس معنی میں ہے کہ وہ یہ محسوس کریں کہ یہ لوگ اپنے موقف پر بہت سخت ہیں' ڈٹے ہوئے ہیں' ان کو ہلانا آسان نہیں ہے۔ مخالفین و معاندین ایسے محسوس کریں جیسے ہم محاورے میں کہتے ہیں کہ ان میں تو انگلی دھنسانے کا کوئی موقع نہیں ہے' یہ نرم چارہ نہیں ہیں کہ جدھر ہم چاہیں انہیں موڑ لیں' ذرا سی کچھ خاطر مدارات کر کے ان کو اپنی طرف راغب کر لیں' ان کی ذرا سی تالیف قلب کریں اور انہیں اپنے مقصد سے منحرف کر دیں۔ نہیں' یہ بہت بھاری ہیں' چٹان کی مانند اپنی جگہ ڈٹے ہوئے ہیں' جس طرح کوہِ ہمالہ کو ہلانا ممکن نہیں ایسے ہی ان کو ہلانا بھی ممکن نہیں۔ جبکہ آپس میں یہ بہت رحیم اور شفیق ہیں۔ ان کا اپنا کوئی ساتھی آ کر اگر اپنی کوئی ضرورت بیان کرتا ہے تو ﴿یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ﴾ کے مصداق وہ اسے خود اپنی ذات پر ترجیح دیں گے' چاہے خود تنگی میں ہوں' خود اس شے کی زیادہ احتیاج رکھتے ہوں لیکن وہ اپنے بھائیوں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھیں گے۔ یہ ہے ان کا باہم مہربان ہونا' رحیم ہونا' شفیق ہونا۔ اور

(باقی صفحہ ۸۶ پر)

تحریکِ اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ

''یا چناں کن یا چنیں!''

اپریل ۹۶ء کے میثاق میں شائع شدہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تحریر
جسے قندِ مکرر کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے

''تحریک اسلامی'' ایک جانب تو ادویات کے ''جنرک ناموں'' (Generic Names) کی طرح کا عمومی عنوان بھی ہے جس کے ذیل میں عالمِ اسلام کی جملہ احیائی تحریکیں شامل ہیں' لیکن دوسری جانب یہ ایک ایسی پاکستانی تنظیم کا ''عنوانِ خاص'' (Brand Name) یا اسمِ علم بھی ہے جو گزشتہ سال اپریل میں منصۂ شہود پر آئی تھی اور ایک سال سے بھی کم مدت میں تقسیم ہو کر دو دھڑوں کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اور یہ ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دونوں دھڑے ایک ہی نام اختیار کیے رکھتے ہیں اور مختلف سیاسی اور مذہبی تنظیموں (جیسے مسلم لیگ' جمعیت علماء اسلام' جمعیت علماء پاکستان وغیرہ) کے مانند اپنے اپنے قائدین کے ناموں سے معنون ''گروپس'' کی صورت اختیار کرتے ہیں یا ان میں سے کوئی ایک اپنا نام تبدیل کر لیتا ہے!

''جنرک'' اعتبار سے برعظیم پاک و ہند کی جماعت اسلامی اور عالمِ عرب کی الاخوان المسلمون ہوں جو لگ بھگ ساٹھ ستر سال سے مسلسل برسرکار ہیں' یا انڈونیشیا کی مسجومی پارٹی ہو جو شروع تو ان کے ساتھ ہی ہوئی تھی لیکن بعد میں طویل عرصہ تک پس منظر میں رہی اور اب حال ہی میں دوبارہ منظر عام پر آ رہی ہے' یا ایران کے فدائین ہوں جو آغاز کے اعتبار سے تو ان سب ہی کے ہم عصر تھے لیکن پھر ''پردۂ غیبوبت کبریٰ'' میں چلے گئے ـــــ ان سب کو ایک ہی عظیم تر تحریک اسلامی کی مختلف تنظیمی ہیئتیں قرار دیا جا سکتا ہے' اس لئے کہ جناب نعیم صدیقی کا یہ شعر کہ ؎

''ہے ایک ہی نغمہ کہیں اونچا کہیں مدھم
ہے ایک ہی جذبہ کہیں واضح کہیں مبہم''

ان سب پر بالکلیہ منطبق ہوتا ہے۔

یہ دوسری خالص مذہبی یا نیم مذہبی و نیم سیاسی جماعتوں سے اس اعتبار سے بالکل ممیّز' اور باہم ایک دوسرے سے مشابہ ہیں کہ ان کے نزدیک اسلام ''دین'' یعنی مکمل نظامِ زندگی ہے' صرف ''مذہب'' یعنی محض عقائد و عبادات اور چند معاشرتی رسومات و معمولات پر مشتمل انفرادی معاملہ نہیں۔ اور مسلمانوں کا اصل فرضِ منصبی ''اقامتِ دین'' ہے' یعنی یہ کہ اسلام کو ایک مکمل سیاسی' معاشی اور معاشرتی نظام...... یعنی Politico-Socio-Economic System کی حیثیت سے بالفعل قائم کیا جائے۔ چنانچہ یہ سب تحریکیں یا تنظیمیں فرقہ واریت سے مبرا' اور فقہی و روحانی مسالک و مذاہب کے ضمن میں وسیع المشرب ہیں ـــــ جبکہ' صرف ایک استثناء کے سوا' باقی جملہ مذہبی تنظیمیں خالص فرقہ وارانہ بنیادوں پر قائم ہیں اور اپنے اپنے مسلکوں سے متعلق عوام کے تعاون سے موجودہ سیاست کے مروّجہ اصولوں کے مطابق کشاکشِ اقتدار میں اپنی بساط کے مطابق بھرپور طور پر شریک ہیں۔

وہ ''واحد استثناء'' جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے' تبلیغی جماعت کا ہے جو متعدد اعتبارات سے عجیب و غریب بھی ہے اور اپنی مثال آپ بھی۔ اس لئے کہ اس کا تصورِ اسلام خالص ''مذہبی'' ہے' چنانچہ نہ یہ سیاسی ہے نہ انقلابی' بایں ہمہ یہ خود نہایت ''متحرک'' بھی ہے اور حد درجہ فعال بھی۔ اس طرح اگرچہ اس میں زیادہ تر ایک ہی مسلک و مشرب کے لوگ شامل ہیں (یعنی حنفی دیوبندی) لیکن فرقہ واریت کو اس کی بنیاد میں ہرگز کوئی عمل دخل حاصل نہیں ہے۔ مزید برآں اگرچہ اس کا تنظیمی ڈھانچہ پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے لیکن ع ''ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے!'' کے مصداق اسے نہ ٹھیٹھ دینی اصطلاح کے مطابق ''جماعت'' قرار دیا جا سکتا ہے' نہ موجودہ دنیا کے مروّجہ اعتبارات سے! اس لئے کہ ایک جانب نہ تو اس کی عہدِ حاضر کے مروّجہ نظاموں کے

مطابق کوئی بنیادی اور مستقل رکنیت (membership) ہے، نہ کوئی تحریری دستور، اور دوسری جانب اگرچہ جب تبلیغی گروپوں کی تشکیل ہوتی ہے تب تو باقاعدہ امیر مقرر کئے جاتے ہیں لیکن کم ازکم فی الوقت اس کا نہ کوئی عالمی امیر ہے نہ پاکستان کی جماعت کا۔ گویا آنحضور ﷺ کے قولِ مبارک ((لَا جَمَاعَةَ اِلَّا بِالْاِمَارَةِ)) (سنن دارمیؒ) کے مطابق جماعت قرار پانے کی شرطِ لازم پوری نہیں ہوتی (اس لئے کہ مولانا انعام الحسنؒ کے انتقال کے بعد کسی ایک شخص کو ''امیر'' نہیں بنایا گیا بلکہ تین افراد پر مشتمل بورڈ بنادیا گیا ہے، جن میں سے دو تو ''صاحبزادگان'' ہیں، یعنی ایک امیر ثانی مولانا محمد یوسفؒ کے پوتے اور دوسرے امیر ثالث مولانا انعام الحسنؒ کے بیٹے اور ایک معمر بزرگ ہیں۔)

ادھر ''عظیم تر تحریک اسلامی'' کی دو نمایاں ترین تنظیمی صورتیں یعنی غیر منقسم ہندوستان کی جماعت اسلامی اور عالمِ عرب کی الاخوان المسلمون امتدادِ زمانہ کے باعث طبعی طور پر شکست وریخت کا شکار ہوئیں اور ان میں سے ہر ایک کی کوکھ سے متعدد تنظیموں اور جماعتوں نے جنم لیا۔ مثلاً مصر کی الاخوان المسلمون کے مؤسس اور اوّلین مرشد عام شیخ حسن البنا شہیدؒ کے ایک ساتھی اور ارادت مند شیخ تقی الدین نبہانیؒ نے ان کی زندگی ہی میں علیحدہ راستہ اختیار کر کے ''حزب التحریر'' کی بنیاد رکھی، پھر کچھ عرصہ کے بعد جناب عمر تلمسانی کی امارت کے زمانے میں اولاً ''التکفیر والھجرۃ'' نامی متشدد اور دہشت گرد گروہ علیحدہ ہوا اور پھر ''جماعتِ اسلامیہ'' (جس کا تلفظ ''گماعہ اسلامی'' کیا جاتا ہے) علیحدہ ہوئی۔ اسی طرح جماعت اسلامی ہند بھی اوّل تو ہندوستان کی تقسیم در تقسیم کے نتیجے میں خود بھی چھ جماعتوں میں تقسیم ہو چکی ہے (یعنی جماعتِ اسلامی پاکستان، جماعت اسلامی بھارت، جماعت اسلامی بنگلہ دیش، جماعتِ اسلامی کشمیر، جماعت اسلامی آزاد کشمیر اور جماعت اسلامی سری لنکا) دوسرے اس سے مختلف مواقع پر علیحدگی اختیار کرنے والوں نے بھی علیحدہ علیحدہ ناموں سے جماعتیں قائم کرنے کی متعدد کوششیں کیں جن میں سے پاکستان میں ایک راقم الحروف کی قائم کردہ ''تنظیم اسلامی'' ہے جو بحمدِ اللہ اکیس برس سے مسلسل مدھم رفتار لیکن مستقل مزاجی

کے ساتھ' سوائے چند افراد کی وقتاً فوقتاً علیحدگی کے' کسی بھی بڑے شکست و ریخت سے محفوظ و مامون رہتے ہوئے بھی کام کر رہی ہے ___ دوسرے نمبر پر حال ہی میں پنجاب میں مولانا مودودی مرحوم کے اوّلین رفیق کار اور مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے بعد جماعت اسلامی پاکستان کے بلاشبہ نمبر تین مصنف و مقرر جناب نعیم صدیقی صاحب کی امارت میں قائم ہونے والی ''تحریک اسلامی'' تھی' جس کے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا 'ایک سال سے بھی کم مدت میں دو ٹکڑے ہو چکے ہیں' جن میں سے نعیم صدیقی صاحب کا ساتھ دینے والا ٹکڑا دوسرے کے مقابلے میں تعدادِ ارکان کے اعتبار سے چھوٹا ہے۔

پاکستان میں گزشتہ پچاس (قمری) سالوں کے دوران میں اور جتنے اکابر یا اصاغر جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے یا خارج کر دیئے گئے ان میں سے دوسرے متعدد حضرات نے بھی جماعتیں یا تنظیمیں بنانے کی کوشش تو کی لیکن کسی اور کو کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ اسی طرح میری محدود معلومات کی حد تک بھارت کی جماعت اسلامی سے بھی حیدر آباد دکن سے تعلق رکھنے والے چند حضرات نے علیحدہ ہو کر ایک نئی جماعت بنائی تھی جس کے سربراہ اس علاقے سے جماعت کے رکن اول مولانا محمد یونس مرحوم تھے' لیکن وہ بھی چل نہیں سکی تھی! (واللہ اعلم!)

پاکستان کی تاریخ کے ابتدائی دس سالوں کے دوران میں تحریک اسلامی یا تحریک اقامتِ دین' جماعتِ اسلامی کے عنوان سے' چند سو اراکین اور چند ہزار کارکنوں کی نہایت منظّم' متحد' پُر جوش اور انتھک محنت و مشقت اور ایک شخصِ واحد یعنی مولانا مودودی مرحوم کی ہمہ جہت اور ہر اعتبار سے مسلّم اور متفق علیہ قیادت کی بنا پر بہت سی بڑی اور پرانی مذہبی و سیاسی جماعتوں پر بھاری رہی۔ تا آنکہ ۵۷-۱۹۵۶ء میں یہ ایک عظیم بحران سے دوچار ہوئی جس کے نتیجے میں اس کی قیادت کی پوری صفِ دوم اس سے علیحدہ ہو گئی۔ چنانچہ اس ''خروج'' (Exodus) کے بعد جماعت اسلامی کی امارت کے لئے مولانا مودودی مرحوم کے بعد مولانا مودودی کے سینئر رفقاء میں سے میاں طفیل محمد صاحب کے سوا کوئی نہ بچا۔

اُس وقت جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والوں میں تین اشخاص سب سے زیادہ نمایاں ہوئے: ایک سابق امیر جماعت اسلامی پنجاب اور مدیر روزنامہ ''تسنیم'' لاہور جناب سعید ملک (مرحوم) جنہوں نے شدید جارحانہ انداز اختیار کیا اور جماعت کی پوری نوکر شاہی اور بعض اہم قائدین پر جھوٹ' فریب اور خیانت تک کے الزام عائد کیے اور باقاعدہ پریس کانفرنس میں علیحدگی کا اعلان کیا۔ دوسرے ان سطور کا ناچیز راقم جس کا اختلاف خالص اصولی تھا' یعنی یہ کہ ''جماعت اپنے ابتدائی اور ٹھیٹھ اصولی اسلامی' انقلابی رول کو ترک کر کے اب صرف ایک ''اسلام پسند'' قومی سیاسی جماعت کا رول اختیار کر چکی ہے جس سے رجوع لازمی ہے!'' اور جو اپنی نوعمری اور بے بضاعتی کے باوجود ''نمایاں'' اس لئے ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے ایک مفصل بیان بھی تحریر کیا تھا (جو دس سال بعد ۱۹۶۶ء میں ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے سوا دو سو صفحات پر مشتمل کتاب کی صورت میں شائع ہوا) اور پھر اپنی تمام تر ''بے کسی'' کے علی الرغم ماچھی گوٹھ کے سٹیج سے مسلسل تین گھنٹے تک مولانا مودودی کی بعد از تقسیم ہند پالیسی پر تنقید کی ''ناکام'' کوشش بھی کی تھی۔ تیسرے نمبر پر مولانا امین احسن اصلاحی تھے' جو اگرچہ بقول شورش کاشمیری مرحوم مولانا مودودی کے ''اینجلز'' بھی تھے اور ''حکیم نور الدین'' بھی' اور اس اعتبار سے تو بلاشبہ مولانا مودودی کے بعد جماعت اسلامی پاکستان کی نمایاں ترین شخصیت تھے' لیکن اس جائزے میں انہیں تیسرے نمبر پر اس لئے رکھا جا رہا ہے کہ اگرچہ انہیں فی الجملہ سعید ملک صاحب کی باتوں سے بھی اتفاق تھا —— اور میرے تجزیئے سے بھی وہ بہت حد تک متفق تھے' لیکن انہوں نے اپنی علیحدگی کی اصل اساس ان اُمور کو نہیں بلکہ صرف اس بات کو بنایا تھا کہ ان کے نزدیک مولانا مودودی نے شخصی طور پر ''آمرانہ'' روش اختیار کر لی تھی اور جماعت کا نیا دستور بھی ''شورائیت'' کی بجائے ''آمریت'' پر استوار کر لیا تھا۔ تاہم علیحدگی کے موقع پر جو خط و کتابت ان اعاظم رجال کے مابین ہوئی وہ اس اعتبار سے حیرت انگیز بھی ہے اور عبرت آموز بھی کہ مسلسل سترہ سال تک یک جان دو

قالب رہنے والے انسانوں کے مابین دفعتہً غیظ و غضب‘ بدگمانی و بداعتمادی اور طنز و استہزاء کی ایسی گھمبیر فضا کیسے پیدا ہو گئی۔ (یہ خط و کتابت میری تالیف: ’’تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب‘‘ میں من وعن درج ہے۔)

کیفیت و نوعیت کے اعتبار سے تو اس سے ملتی جلتی‘ لیکن کمیت کے اعتبار سے کہیں زیادہ عبرتناک مثال نعیم صدیقی صاحب کی ’’تحریک اسلامی‘‘ کے حالیہ بحران میں سامنے آئی ہے‘ کہ اپریل ۹۵ء میں جس شخص کو تقریباً بالاتفاق ’’امیر‘‘ چنا گیا تھا‘ اوّل تو چند ہی مہینوں کے اندر اندر خود اسے اپنے قریب ترین ساتھیوں میں نجویٰ اور سازش کی بو آنے لگی اور وہ محسوس کرنے لگے کہ انہیں محض ’’درشنی پہلوان‘‘ کی حیثیت دے کر کچھ ہوشیار لوگوں نے سارے اختیارات خود سنبھال لئے ہیں‘ اور ان کے ردِ عمل میں ان کے قریبی ساتھیوں کے جو خطوط پندرہ روزہ ’’نشور‘‘ میں شائع ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی محبوب ترین اور معتمد ترین شخصیت چند ماہ کے اندر اندر ’’ارذل العمر‘‘ کو بھی پہنچ گئی اور ’’مطلق العنانی‘‘ کے ’’فراق‘‘ میں عقل و منطق اور عدل و انصاف کی جملہ حدود کو بھی پھلانگ گئی! نتیجتاً دیکھتے ہی دیکھتے ایک جانب امیر نے مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ دونوں کو معزول کر دیا تو دوسری جانب شوریٰ نے امیر کو معزول کر کے نئے امیر کا انتخاب کرا لیا۔ گویا وہ سب کچھ جو بالعموم مساجد کی انتظامی کمیٹیوں‘ سماجی انجمنوں اور دیگر مذہبی و سیاسی جماعتوں میں ہوتا رہتا ہے ’’تحریک اسلامی‘‘ میں بھی ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ع ’’چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!‘‘

ہمیں نہ مولانا مودودی کے خلوص و اخلاص میں شبہ تھا‘ نہ مولانا اصلاحی کے۔ اسی طرح اب نہ جناب نعیم صدیقی کے اخلاص میں کوئی شک ہے نہ ان کے سابقہ اہم رفقاء کے۔ بلکہ اُس وقت تو چونکہ راقم خود بھی ع ’’کون طوفاں کے تھپیڑے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو!‘‘ کے مصداق ’’بحران‘‘ کے تھپیڑے کھا رہا تھا لہٰذا اس کے جذبات میں صدمے کے ساتھ ساتھ غصے کی آمیزش بھی تھی —— اب تو اس حالیہ بحران میں کسی بھی جانب سے شریک یا ملوث نہ ہونے کے باعث متذکرہ بالا صورتحال پر رنج و افسوس کے

سوا کوئی ردِّعمل نہیں ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ میں نے تو اگست ۹۵ء کی تقریر میں بڑے شد و مد کے ساتھ جماعت اسلامی، تنظیم اسلامی اور تحریک اسلامی کے مابین ''وفاق'' کے قیام کی تجویز پیش کی تھی اور کسی مثبت ردِّعمل کا منتظر تھا (خصوصاً اس لئے کہ ایک جانب دو سو میل شمال سے پروفیسر خورشید احمد صاحب کے ادارے سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''دینی صحافت'' سے حوصلہ افزا تبصرہ موصول ہوا تھا تو دوسری جانب دو ہزار میل جنوب میں واقع بنگلور سے شائع ہونے والے ماہنامے ''ینگ مسلم ڈائجسٹ'' نے بھی پذیرائی کی تھی!) لیکن ع ''ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال!'' کے مصداق ابھی ''کثرت میں وحدت'' کی شان کا کسی ادنیٰ درجہ میں بھی ظہور نہیں ہوا تھا کہ ع ''خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے!'' کے مصداق تفرقہ و تقسیم کا عمل ایک قدم اور آگے بڑھ گیا اور ''تحریک اسلامی'' خود دو لخت ہو گئی!

راقم کے نزدیک اس حادثۂ فاجعہ کا یہ پہلو اہم تر اور قابلِ توجہ ہے کہ چونکہ ابھی پالیسی یا طریقہ کار کے ضمن میں تو کسی اختلافِ رائے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا، لہٰذا نزاع کی کل بنیاد تنظیمی ڈھانچہ یا دستوری خاکہ —— اور اس کے ضمن میں بھی یہ اہم اور اساسی مسئلہ ہے کہ اختیارات کے اعتبار سے زیادہ بھاری پلڑا ''امیر'' کا ہو یا ''شوریٰ'' کا؟ چنانچہ اس موقع پر جناب نعیم صدیقی نے جو باتیں کہی ہیں ان میں سے اہم ترین یہی ہے کہ کچھ لوگوں نے سازش اور ریشہ دوانی کے ذریعے ایک ''غیر اسلامی'' دستور بنوالیا۔ جس سے ان کی مراد غالباً یہی ہے کہ اس کی رُو سے مجلس شوریٰ کے مقابلے میں ''امیر'' بالکل بے دست و پا بنا دیا گیا ہے۔ اور یہ وہ مسئلہ ہے جس پر اب سے ٹھیک پچاس سال قبل ۱۹۴۶ء میں غیر منقسم ہندوستان کی جماعت اسلامی کے کُل ہند اجتماع منعقدہ الٰہ آباد میں بھی شدید اختلافِ رائے سامنے آیا تھا۔ یعنی جبکہ مولانا مودودی مرحوم اس کے قائل یا مدعی تھے کہ اسلامی نظمِ جماعت میں اصل اختیار ''امیر'' کو حاصل ہوتا ہے جو مجلس شوریٰ کی اکثریت کی رائے کو ''ویٹو'' کر سکتا ہے، مولانا اصلاحی اس پر جازم تھے کہ امیر کو شوریٰ کی اکثریت کے ''تابع'' ہونا ضروری ہے۔ جس پر اُس وقت تو

مولانا مودودی نے ''حکمتِ عملی'' کے تحت کسی قدر گھٹنے ٹیک دیئے تھے اور ایک پیچ در پیچ ''مصالحتی فارمولا'' قبول کر لیا تھا' لیکن دس سال بعد ان کا اصل ذہن پہلے تو اجتماع ماچھی گوٹھ کے موقع پر بقول مولانا اصلاحی ''خلوتیانِ خاص'' کی محفل میں اور پھر بھرپور طور پر کوٹ شیر سنگھ کے اجلاسِ شوریٰ میں سامنے آیا' جس کے نتیجے میں جماعت کے دستور میں پورا اختیار امیر کے ہاتھ میں مرکوز کر دیا گیا۔ جس پر مولانا اصلاحی یہ کہتے ہوئے جماعت سے رخصت ہو گئے کہ مولانا مودودی نے وہ بلی دوبارہ تھیلے سے نکال لی ہے جسے وہ اپنی دانست میں ''گربہ کشتن روزِ اوّل'' کے مصداق ۴۶ء ہی میں مار چکے تھے۔ (ان تمام تفاصیل کے لئے دیکھئے میری تالیف: ''تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب'') بعد میں یہ دستور مولانا مودودی کی زندگی تک تو بالکل ٹھیک کام کرتا رہا' اس لئے کہ وہ تحریک اسلامی کے داعیٔ اوّل بھی تھے اور جماعت اسلامی کے مؤسس بھی' پھر میاں طفیل محمد صاحب کے دورِ امارت میں بھی اس بنا پر چلتا رہا کہ جماعت کے ارکان کی اکثریت' صحیح یا غلط طور پر' یہ سمجھتی رہی کہ وہ مولانا مودودی کے ''معتمد ترین'' شخص ہیں' لیکن جیسے ہی قاضی حسین احمد ''سریر آرائے امارت'' ہوئے جماعت کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی اکثریت ''الامان'' اور ''الحفیظ'' پکار اٹھی —— چنانچہ یہ اسی کے ردعمل کا مظہر ہے کہ ''نومولود تحریک اسلامی'' نے اپنے اساسی دستور میں بالکل برعکس رخ اختیار کر لیا اور ''امیر'' کو بالفعل ''صدر'' کی حیثیت دے دی!

بہرحال چونکہ ابھی تحریک اقامتِ دین کو بہت طویل سفر طے' اور نہایت کٹھن مرحلے سر کرنے ہیں' ضروری ہے کہ ''عظیم تر تحریک اسلامی'' سے عملی یا ذہنی وابستگی رکھنے والا ہر شخص اس اہم اور اساسی مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کرے۔ اور خاص طور پر چونکہ ۱۱۔۱۲ اپریل کو ''تحریک اسلامی'' کے نعیم صدیقی صاحب سے باغی دھڑے کا اجتماع ہونے والا ہے' مناسب ہوگا کہ اس کے اربابِ حل وعقد اس معاملے میں راقم کی معروضات پر بھی غور فرمالیں جو خالصتاً اقامت دین کے عظیم تر مقصد اور تمام تر نصح و خیر خواہی کے جذبہ سے پیش کی جارہی ہیں۔

تاہم اس سے قبل کہ اس معاملے میں اپنی رائے پیش کی جائے' مناسب ہے کہ اس خط کا اقتباس سامنے آ جائے جو راقم نے ۲۲ر جنوری ۹۵ء مطابق یکم رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ کو نعیم صدیقی صاحب کی خدمت میں ارسال کیا تھا:

''کل آپ سے حاضری کی اجازت حاصل کر کے گاڑی کے بارے میں معلوم کیا تو پتہ چلا کہ تین گاڑیوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں۔ Taxi بھی فوری طور پر نہ مل سکی۔ اور بعد میں پے بہ پے ایسی مصروفیات نکل آئیں کہ حاضری نہ ہو سکی ـــــ اب کل علی الصبح امریکہ کے لئے روانگی ہے' لہٰذا عریضہ ہذا کے ذریعے ہی حاضر ہوں!

اگر چہ میرا یہ مقام ہرگز نہیں کہ میں آپ کو کوئی مشورہ دے سکوں' لیکن حدیث نبویؐ ''الدینُ النصیحۃُ'' کی رو سے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے دو درخواستیں پیش خدمت ہیں:

ایک یہ کہ آپ تحریک اسلامی کے تنظیمی قضیہ سے اپنے آپ کو بالکل علیحدہ کر کے' صرف تصنیف و تالیف کے کام میں ہمہ تن اور ہمہ وقت مشغول ہو جائیں۔ اس وقت جو صورت بن گئی ہے اس سے جگ ہنسائی تو ہو ہی رہی ہے ـــــ ''بعد از خرابیٔ بسیار'' بھی کسی خیر کی کوئی امید نہیں ہے ـــــ اور اس سے لامحالہ ''عظیم تر تحریک اسلامی'' کو بہت گزند پہنچے گا۔ مجھے خوب اندازہ ہے کہ اس قسم کے معاملات میں جب ایک بار ''پیچ پڑ جائے'' یا ''سینگ پھنس جائیں'' تو اس سے باہر نکلنا بہت مشکل اور بہت بڑے ایثارِ ذات ہی کے ساتھ ممکن ہے' تاہم میری مخلصانہ درخواست یہی ہے کہ آپ یہ کڑوا گھونٹ بھر لیں ـــــ آپ کو بخوبی اندازہ ہوگا کہ میری ساری نیاز مندی آپ کی ذات سے ہے۔ دوسری طرف جلیل خان صاحب ہوں یا کوئی اور' میری تو ان سے پہلی ملاقات بھی آپ ہی کے واسطے سے ہوئی ہے۔ اور اگر چہ اب میرا کوئی تنظیمی یا جماعتی تعلق نہ جماعت اسلامی سے ہے نہ تحریک اسلامی سے' تاہم مجھے عظیم تر تحریک اسلامی کی عزت اور نیک نامی بھی عزیز ہے کہ اس کی رہی سہی اور بچی کھچی پونجی بھی ختم نہ ہو جائے ـــــ اور اللہ گواہ ہے کہ ذاتی طور پر آپ کی عزت اور وقار کا بھی تہہ دل

سے خیال ہے—''

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ —— ''اقامتِ دین'' کی جدوجہد کے لئے قائم ہونے والی تنظیم یا جماعت کے تنظیمی ڈھانچے کے مسئلے پر راقم نے ۵۷۔۵۶ء ہی سے غور کرنا شروع کر دیا تھا' اور بحمد اللہ راقم کی ایک رائے بھی اواخر ۵۸ء ہی میں بن گئی تھی' اگر چہ اس پر عمل کا آغاز لگ بھگ بیس سال بعد ۷۷ء میں ہوا۔ اور درمیانی عرصے میں راقم متبادل صورتوں پر بھی عمل کے لئے ذہناً وقلباً پوری طرح آمادہ رہا۔

راقم کی وہ رائے جو اَب مزید تقریباً بیس سال گزرنے کے بعد کافی بڑے حلقے میں معلوم ومعروف ہے' یہ ہے کہ —— اگر چہ عہدِ حاضر کے جملہ جمہوری ودستوری نظام ہائے جماعت بھی شریعت کی رو سے حرام یا ممنوع نہیں' بلکہ اصلاً مباح ہیں۔ (یہاں تک کہ ایک دستور کے ساتھ ''حلف وفاداری'' بھی ایک طرح کی دستوری ''بیعت'' ہی ہے!) تاہم واحد منصوص ومسنون وماثور طریقہ ''شخصی بیعت'' کا ہے! —— مزید برآں یہی کسی انقلابی جدوجہد کے لئے عقل ومنطق کی رو سے بھی زیادہ درست اور مفید تر ہے!

تاہم زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ دونوں طریقے ایک دوسرے سے بالکل متمیز بلکہ متضاد ہیں جن میں سے بالکل ''یا چناں کن یا چنیں'' کے مصداق کسی ایک کو بتمام وکمال قبول کر لینا چاہئے۔ اصل خرابی ان دونوں کے مابین ''پیوندکاری'' سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ اصلاً ایسی پیوندکاری ہی کے نتیجے میں جماعت اسلامی اپنے ۵۷۔۵۶ء والے شدید ترین بحران سے دوچار ہوئی تھی اور اسی کے باعث اب نوزائیدہ ''تحریک اسلامی'' اپنے حالیہ بحران کا شکار ہوئی ہے اور دونوں مواقع پر تلخی' تندی' تیزی' جھنجلاہٹ اور ان سب سے بھی بڑھ کر ایک دوسرے کی نیتوں تک پر حملے کی مکروہ ترین صورتیں پیدا ہوئی ہیں۔

شخصی بیعت کا نظام کسی ایک ''داعی'' کی ذات سے شروع ہوتا ہے' جو پہلے انبیاء معصومین ہوا کرتے تھے' اور ختمِ نبوت کے بعد غیر نبی اور غیر معصوم انسان ہی ہو سکتے ہیں۔ یہ داعی سامنے آتا ہے' اپنے خیالات ونظریات کی اشاعت کرتا ہے' اور اپنے

ہدف اور طریق کار کی بھی وضاحت کرتا ہے اور پھر ''مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ'' کی صدا بلند کرتا ہے۔ پھر جو شخص اس سے فی الجملہ متفق بھی ہو اور اس کے خلوص و اخلاص پر اعتماد بھی کرتا ہو وہ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس کا ''ساتھی'' بن جاتا ہے۔ اور اپنے ''سمع و بصر و فواد'' سے صرف یہ دو کام لیتا ہوا اس کی اطاعت پر کاربند رہتا ہے کہ اوّلاً مقدور بھر خود بھی غور و فکر کرتا رہے اور پیش آمدہ مسائل و مراحل کے ضمن میں اپنی رائے بھرپور طور پر پیش کرتا رہے' اس سے بالکلیہ قطع نظر کہ وہ قبول کی جائے یا ردّ کر دی جائے! اور ثانیاً یہ دیکھتا رہے کہ ''داعی'' جو اب ''امیر'' کی حیثیت رکھتا ہے' کہیں کتاب و سنت کی حدود سے تجاوز نہ کر جائے! گویا کتاب و سنت کے دائرے کے اندر اندر اس امیر کی حیثیت ''آمر'' کی ہے۔ (واضح رہے کہ عربی قواعد کی رو سے ''آمر'' اسم فاعل ہے جس میں ایک طرح کا عارضی پن شامل ہوتا ہے' جبکہ ''امیر'' صفتِ مشبہ ہے جس میں دوام و استمرار کا رنگ پایا جاتا ہے!) ــــ اس طرح یہ جماعت اوپر سے نیچے کی طرف بڑھتی ہے' اور اس میں نہ کبھی امیر کا انتخاب ہوتا ہے نہ ہی کبھی فیصلوں کے لئے آراء کی گنتی کی جاتی ہے ــــ مزید برآں' اس نظامِ جماعت میں مناصب کے لئے ''امیدواری'' بھی نہایت ناپسندیدہ شے ہے۔ رہی کنویسنگ' نجویٰ اور گروہ بندی تو وہ تو گناہ کبیرہ کے درجہ میں شمار ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس مغرب نے ریاست اور جماعت کے لئے جو جمہوری اور دستوری نظام صدیوں کے عمرانی ارتقاء کے نتیجے میں develope کیا ہے وہ نیچے سے اوپر کی طرف چلتا ہے۔ چنانچہ اس کی اساس ''شہریت'' یا ''رکنیت'' پر ہے' اور اوپر کے جملہ مناصب درجہ بدرجہ ''انتخابات'' کے ذریعے وجود میں آتے ہیں۔ پھر ہر سطح پر منصب داروں یا عہدیداروں پر Checks and Balances کا پورا اہتمام کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مجالس منتظمہ یا مجالس قانون ساز یا مجالس مشاورت بھی انتخابات ہی کے ذریعے وجود میں آتی ہے اور پھر عہدیداروں اور ان مجالس کے مابین تقسیم اختیارات کے پیچ در پیچ فارمولے بنائے جاتے ہیں۔ اور اگر ''صدور'' کے اختیارات غالب

ہوں تو وہ نظام ''صدارتی'' بن جاتا ہے اور اس کے برعکس اگر مجالس کی کثرتِ رائے صدور پر ''حاکم'' اور ''لازم'' بن جائے تو اسے ''پارلیمانی'' کہا جا سکتا ہے۔ بہر حال اس نظام میں سربراہ ''صدر'' کہلاتے ہیں ''امیر'' نہیں!

لیکن اہم تر معاملہ یہ ہے کہ اس نظام میں کھلم کھلا امیدواری اور کنویسنگ اور اعلانیہ دھڑے بندیاں اور بلاک سازیاں اجزائے لاینفک کی حیثیت رکھتی ہیں اور ہرگز نہ معیوب ہیں نہ غیر مستحسن' بلکہ Checks and Balances کا پورا نظام بنتا ہی ان کی بنا پر ہے۔ چنانچہ حال ہی میں لاہور میں امریکہ کے کونسلیٹ سے منسلک کلچرل اٹیچی مسٹر مہونی ملاقات کے لئے تشریف لائے اور ان سے عہد حاضر میں نظامِ خلافت کے دستوری ڈھانچے کے موضوع پر مفصل گفتگو ہوئی تو انہوں نے صاف فرمایا کہ ہمارا تو سارا نظام تعمیر ہی اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ ہر شخص چور اور بے ایمان ہے اور دستوری اور قانونی ڈھانچہ ایسا ہونا چاہئے کہ اس کے ذریعے چوری اور بے ایمانی کو کم سے کم کیا جا سکے!

بیسویں صدی عیسوی کے دوران ہندوستان کے ہندوؤں نے دو عظیم جماعتیں قائم کیں۔ ایک خالص سیاسی یعنی انڈین نیشنل کانگریس جو صد فی صد جمہوری اور دستوری تھی۔ چنانچہ اس میں امیدواریاں بھی ہوتی تھیں اور کنویسنگ بھی۔ گویا الیکشن باقاعدہ ''لڑے'' جاتے تھے۔ مزید برآں دھڑے بھی کھلم کھلا بنتے تھے اور بلاک بھی اعلانیہ بنائے جاتے تھے اور ان کے مابین رسہ کشی بھی برملا ہوتی تھی۔ ان ہی کیفیات کے ساتھ اس جماعت نے آزادی کی جدوجہد میں بھی اپنا کردار ادا کیا' اور پھر آزادی کے بعد بھی اب تک یہ جماعت بھارت کی حکومت چلا رہی ہے۔ اس جماعت نے ہمیشہ ایک خالص مغربی انداز کی سیاسی پارٹی کا رول ادا کیا اور اپنے جملہ امور کی گاڑی کو ہمیشہ دستور کی پٹری ہی پر چلایا۔ تاہم واضح رہے کہ جدوجہد آزادی (یا جہاد حریت) کے دوران جب بھی کبھی ''راست اقدام'' کا مرحلہ آتا تھا تو یہ اپنے صحیفہ دستور کو بند کر کے رکھ دیا کرتی تھی اور یکے بعد دیگرے ''ڈکٹیٹر'' نامزد کر دیئے جاتے تھے۔ اس لئے کہ ''تحریک'' چلانے کے لئے یہ شے ناگزیر برائی کا درجہ رکھتی ہے۔

اس کے برعکس معاملہ ہے مذہبی اوراحیائی جماعت ''آر ایس ایس'' کا' کہ اس کا سربراہ ''صدر'' نہیں ''گورو'' ہوتا ہے جومنتخب نہیں ہوتا بلکہ سابق گوروکا نامزد کردہ ہوتا ہے' جو اسے اپنے دورِ سربراہی ہی میں نامزد کر کے زیر تربیت رکھتا ہے' جو اس کے انتقال پر''تاحیات خلیفہ'' بن جاتا ہے۔ چنانچہ ۲۵ء سے ۹۵ء تک ستر سالوں میں اس کے داعی اور مؤسس کے بعد دو گورو تو سابق گوروؤں کے انتقال ہی پر گورو بنے' البتہ اب چوتھے گوروکو تیسرے ہی نے خود نامزد کر کے اپنی علالت کے باعث اپنی زندگی ہی میں سربراہی سونپ دی ہے۔

اس جماعت کی وسعت اور قوت کا عالم یہ ہے کہ اب سے دس برس قبل اس پر ایک کتاب شکاگو سے ''Brotherhood in Saffron'' کے نام سے شائع ہوئی تھی' تو اس میں اس کے تربیت یافتہ والنٹیرز کی تعداد پچیس لاکھ بتائی گئی تھی۔ (اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ دس سالوں کے دوران بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی ہوگی!) اور اس کے نظم وضبط اور ڈسپلن کی پابندی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اجودھیا کی مسجد کو شہید کرنے کے لئے تین لاکھ والنٹیرز ہندوستان کے کونے کونے سے اجودھیا پہنچے۔ لیکن اس سفر کے دوران پورے ہندوستان میں ''مسلم کش فساد'' تو درکنار کسی مسلمان کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔ چنانچہ وہ لوگ پورے امن وضبط کے ساتھ گئے' اپنا کام پورا کیا اور اسی امن اور نظم وضبط کے ساتھ گھروں کو لوٹ گئے —— چھ ہزار کے لگ بھگ مسلمان بعد میں اُس وقت ہلاک ہوئے جب انہوں نے ''احتجاجی'' تحریک میں توڑ پھوڑ کی اور پولیس نے انہیں بھون کر رکھ دیا —— اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت پر بھی نگاہ رہے کہ اس جماعت نے اس قدر قوت و وسعت کے باوجود ملکی انتخابات میں کبھی براہ راست حصہ نہیں لیا' بلکہ پہلے ۱۹۵۱ء میں ''جن سنگھ'' کو اپنا پولیٹیکل فرنٹ قرار دیا اور پھر ۱۹۸۰ء سے ''بی جے پی'' یہ رول ادا کر رہی ہے' جس کے نہایت عسکری بازو (Militant Wings) وشوا ہندو پریشد (V.H.P) اور شیو سینا ہیں! گویا معاملہ اس اعتبار سے بھی کانگریس کے برعکس ہوا۔ یعنی کانگریس نے جب

تحریک چلائی تو دستور کو تہہ کر کے رکھ دیا اور ''آمریت'' اختیار کر لی اور آر ایس ایس نے سیاست میں حصہ لیا تو ''گوروؤں'' والے نظام سے بالکل علیحدہ دستوری اور جمہوری بساط بچھالی۔

اس کے برعکس حال ہمارا رہا کہ جماعت اسلامی نے سیاست میں حصہ لینا چاہا تو بھی اپنی کڑی ''شرائطِ رکنیت'' کو برقرار رکھتے ہوئے' اور انتخابات میں حصہ لینا چاہا تو بھی ابتداءً امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کو حرام قرار دیتے ہوئے — چنانچہ نہایت مایوس کن صورت حال سے سابقہ پیش آیا۔ اور پھر اس کے بعد سے آج تک ''تنزل'' کے ضمن میں مسابقت کی دوڑ لگی ہوئی ہے کہ ادھر جماعت اپنے معیارات کو ایک قدم نیچے لاتی ہے تو ادھر معاشرہ اخلاقی اعتبار سے دو قدم اور نیچے اتر جاتا ہے اور جماعت کے ہاتھ میں ہر بار بھاگتے چور کی لنگوٹی تک نہیں آ پاتی — دوسری طرف نومولود ''تحریک اسلامی'' ہے جو تا حال ''امارت'' اور ''شورائیت'' کی بحثوں میں غلطاں و پیچاں ہے! کاش کہ جماعت اور تحریک' دونوں کے اصحابِ فکر و نظر اور اربابِ حل و عقد ہماری ان گزارشات پر غور کر سکیں —!

پھر ان میں سے بھی جہاں تک جماعت اسلامی کی ''قیادت'' کا تعلق ہے' وہ تو چونکہ بہت اونچی ہواؤں میں اڑنے کی عادی ہے' لہٰذا اس تک تو شاید ہماری یہ گزارشات پہنچ بھی نہ پائیں — البتہ تحریک اسلامی چونکہ ابھی ہماری ہی طرح ''خاک نشین'' ہے' لہٰذا بعید نہیں کہ اس کے ذمہ داران حضرات ان گزارشات پر غور گوارا کر لیں کہ:

❁ اگر تو ''عظیم تر'' تحریک اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے والے یا خارج کئے جانے والے بعض دوسرے حضرات کے مانند اب جناب نعیم صدیقی صاحب سے علیحدہ ہونے والے احباب کا اصل مطمح نظر بھی صرف دعوتی و تبلیغی یا علمی و تعلیمی یا رفاہی و اصلاحی ہے'

❁ یا ان کے پیش نظر بھی اصلاً ملکی سیاست ہی کے اکھاڑے میں اترنا ہے' خواہ

براہ راست خود انتخابات میں حصہ لے کر خواہ کسی سیاسی دھڑے کو تقویت پہنچا کر ——— تب تو دستوری و جمہوری نظام ہی درست ہے' اور اس کے ضمن میں جس طرح انہوں نے جماعت میں شمولیت کی شرائط میں نرمی کر دی ہے (چنانچہ اب ایسے حضرات بھی اس کے رکن ہی نہیں شوریٰ تک میں شامل ہیں جو اپنے کاروبار کے ضمن میں بینک سے سودی قرضے لینے اور انکم ٹیکس کے ضمن میں اخفاء یا غلط بیانی پر مجبور ہیں' بنا بریں اس سے قبل جماعت اسلامی کی رکنیت حاصل نہیں کر سکتے تھے) اسی طرح اختلافِ رائے اور اس کے اظہار ہی کے لئے نہیں بلکہ اپنی رائے کو تقویت پہنچانے کے لئے اعلانیہ اور انفرادی سطح پر یا گروپوں کی صورت میں گفتگوؤں' اور پھر باضابطہ انتخابات میں اپنے ہم خیال لوگوں کے لئے رائے ہموار کرنے کی کوششوں کے ضمن میں بھی اپنے سابقہ معیارات میں نرمی اور تخفیف پیدا کیجئے۔

❁ اور اگر اصل ہدف ''اقامت دین'' کے لئے وہ انقلابی جدوجہد ہے جس کے ابتدائی مراحل کا نقشہ مولانا مودودی مرحوم نے ۴۰ء میں ''اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے!'' نامی خطاب میں پیش کیا تھا اور جس کے آخری مراحل میں لازماً شدید تصادم اور ٹکراؤ اور جان کی بازی لگانا ناگزیر ہوگا تو اس صورت میں ابھی سے ''بیعت شخصی'' ہی کے خالص دینی نظام کو اختیار کر لیجئے تاکہ نفوس ابھی سے ''فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ وَعَلٰی اَثَرَۃٍ'' ——— ''سمع وطاعت فی المعروف'' کے ضمن میں ایثارِ ذات اور ایثارِ رائے کے عادی اور خوگر ہو جائیں ——— اس ضمن میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ کیا آپ کے پاس کوئی شخص بھی ایسا نہیں جس کے خلوص و اخلاص اور اصابتِ رائے پر اتنا اعتماد کیا جا سکے کہ ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیئے جائیں اور وہ جملہ ساتھیوں کے بہترین مشوروں سے استفادہ کرتے ہوئے اطمینان کے ساتھ جماعت کے کام کو آگے بڑھا سکے!

دوسری جانب جناب نعیم صدیقی صاحب کا ساتھ دینے والے احباب اب اگر امیر کے ہاتھ میں فیصلہ کن اختیار دینے کے حق میں ہیں تو ان سے گزارش ہے کہ پھر

سیدھے اور سادے طریقے پر ان کے ہاتھ پر ''بیعت'' ہی کرلیں۔ اس لئے کہ اگر امیر جماعت شوریٰ کی اکثریت کی رائے کو ویٹو کردینے کا مجاز ہو (جیسا کہ مولانا مودودی مرحوم کا خیال تھا) تو خواہ مخواہ لمبے چوڑے دستوری کھکھیڑ میں پڑنے کی آخر کیا ضرورت ہے' جبکہ حیدر آباد دکن کے مولانا محمد یونس کی مرتب کردہ کتاب ''خطوط کے چراغ'' میں مولانا مودودی مرحوم کا جو خط مارچ ۱۹۴۱ء کا شامل ہے' اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم کا اپنا ذہن واضح طور پر شخصی بیعت کے منصوص' مسنون اور ماثور طریقے ہی کی جانب زیادہ رجحان رکھتا تھا۔ (مولانا مرحوم کا یہ خط اس مضمون کے آخر پر دیکھا جاسکتا ہے!)

اور آخری گزارش یہ کہ بیعت خواہ شخصی ہو یا دستوری' دونوں ہی صورتوں میں اگر انتخابات میں حصہ لینے کے ضمن میں میری مولانا مودودی مرحوم ہی کی ۴۵ء کی تحریر پر مبنی اس تجویز کو قبول کرلیا جائے جو میں نے اگست ۱۹۵۱ء کی تقریر میں پیش کی تھی اور ''میثاق'' کے اکتوبر ۹۵ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی تو میں اپنی تنظیم کی جانب سے آپ کے دونوں دھڑوں کے ساتھ ''وفاق'' کی صورت اختیار کرنے کے لئے تیار ہوں تاکہ تقسیم در تقسیم اور تفرقہ و انتشار کا عمل کہیں تو رک کر ع ''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!'' کے مصداق ''توفیق و وفاق'' اور ''توحید و اتحاد'' کی جانب رخ کر سکے — وما علینا الا البلاغ!

جذبِ دروں' شوقِ زیارت اور عقیدت و محبت سے معمور زیارتِ حرمین شریفین کی روداد

شوق حرم

ازقلم: عتیق الرحمٰن صدیقی

زائرین حرمین شریفین کے لئے ایک راہ نما کتاب

دیدہ زیب ٹائٹل' سفید کاغذ' عمدہ طباعت' صفحات : 100 ' قیمت : 45 روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ نور اسلام' رحمٰن مارکیٹ' اردو بازار لاہور

مکتوب گرامی مولانا مودودی مرحوم ومغفور

بنام مولانا محمد یونس، حیدر آباد دکن، مارچ ۱۹۴۱ء

محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ اصطلاح میں بیعت سے مراد اطاعت اور پیروی کا اقرار ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں:

(۱) وہ بیعت جو کسی خاص موقع پر کسی خاص معاملہ کے لئے ہو۔ جیسے بیعت الرضوان تھی کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی افواہ سن کر حضور ﷺ نے اہل مکہ سے جنگ کا ارادہ فرمایا اور اس وقت صحابہ کرامؓ سے اس امر پر بیعت لی کہ وہ پیش آمدہ مہم میں آپؐ کے ساتھ جانفروشی کریں گے۔

(۲) دوسری وہ بیعت جو تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اخلاق وروحانیت کی نیت سے ایک مرشد ومعلم اس شخص سے لیتا ہے جو اس کے پاس تربیت حاصل کرنے کے لئے آئے۔ یہ وہ بیعت ہے جو بالعموم ہر شخص کو کرنی پڑتی تھی جو نبی ﷺ کے ہاتھ پر ایمان لاتا تھا۔ آپؐ اس سے اقرار کراتے تھے کہ شرک، زنا، چوری وغیرہ سے پرہیز کرے گا اور جو احکام خداوند تعالیٰ کی طرف سے آپؐ پہنچائیں گے ان کی اطاعت کرے گا۔ اس بیعت کے لینے کا حق یا تو نبیؐ کو پہنچتا ہے یا اس شخص کو جو نبیؐ کے طریقہ پر ہو۔ یعنی طریقہ نبویؐ کا صحیح علم بھی رکھتا ہو، اس پر خود بھی عامل ہو اور بیعت لینے سے اصلاح وارشاد کے سوا قطعاً دوسری نیت نہ رکھتا ہو۔

(۳) تیسری بیعت وہ ہے جو جماعت اسلامی کے امیر یا امام کے ہاتھ پر کی جاتی ہے اور اس کی نوعیت یہ ہے کہ جب تک امیر یا امام اللہ اور رسول ﷺ کا مطیع ہے اس وقت تک جماعت اسلامی کے تمام ارکان پر اس کی اطاعت فرض ہے۔

((مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً)) اور دوسری تمام احادیث میں جس بیعت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے ان میں بیعت سے مراد تیسری بیعت ہے، کیونکہ اس پر جماعت اسلامی کی زندگی اور اس کے نظم کا قیام منحصر ہے۔ اس سے الگ ہونے یا الگ رہنے کے معنی یہ ہیں کہ نبی ﷺ جس کام کے لئے تشریف لائے تھے اور جس امر عظیم کا بار اُمت پر چھوڑ گئے ہیں اس کو نقصان پہنچایا جائے یا ختم کر دیا جائے۔

قیامِ خلافت: اُمت کا فرضِ منصبی

اسلام کے سیاسی نظام کے قیام کی جدو جہد
کے بارے میں چنداعتراضات کا جواب

تحریر: مولانا سید وصی مظہر ندوی☆

علامہ یوسف القرضاوی اپنے مضمون ''سیاسی اسلام؟'' (شائع شدہ ترجمان القرآن' جون ۲۰۰۲ء) میں لکھتے ہیں:

> ''اسلام ہر مسلمان پر یہ سیاسی ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ ایسی ریاست میں زندگی گزارے جس پر ایک امام کتاب اللہ کی رو سے حکومت کرتا ہو اور عوام نے ان کی بیعت کی ہو۔ اگر کوئی مسلمان ایسا نہیں کرتا تو وہ اہل جاہلیت میں سے ہے۔ مسلم کی صحیح حدیث میں ہے: جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں امام کی بیعت کا قلادہ نہیں ہے تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔''

بعض اعتراض کنندگان کی نگاہ میں یہ بات اس لئے قابل اعتراض ہے کہ اس کے ذریعے امریکہ' برطانیہ اور دوسرے غیر مسلم ممالک میں بسنے اور فوت ہو جانے والے مسلمانوں کے بارے میں جو فتویٰ صادر کیا گیا ہے وہ بہت خوفناک ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول ہے' کیونکہ اس فتویٰ کی رو سے وہ سب اہل جاہلیت قرار پاتے ہیں۔

جناب قرضاوی کی زیر حوالہ عبارت اپنے عموم وشمول کے لحاظ سے اس سے کہیں زیادہ خوفناک ہے جتنی خوفناکی کا حوالہ دے کر معترضین اس پر سوال اٹھاتے ہیں۔ کیونکہ جناب قرضاوی کی شرائط پر پورا اترنے والا تو دنیا میں اس وقت غالباً ایک ملک بھی موجود نہیں ہے جہاں کتاب اللہ کی رو سے حکومت کرنے والا امام موجود ہو اور عوام نے اس کی سمع وطاعت پر کاربند رہنے کی بیعت کی ہو۔

اس وقت دنیا کا کون سا ملک ان شرائط کو پورا کر رہا ہے کہ جناب قرضاوی کے

☆ ٹورانٹو' کینیڈا

فتوے کے مطابق مسلمان اس ملک میں جا کر بس جائیں اور اپنے دین و ایمان کی طرف سے بے خبر ہو کر چین کی زندگی بسر کرنے لگیں۔ پس سوال ''صرف امریکہ، برطانیہ اور دیگر غیر مسلم ممالک میں بسنے اور فوت ہو جانے والوں'' تک محدود نہیں ہے بلکہ دنیا کے تمام مسلمان خواہ وہ کسی نام نہاد مسلم حکومت کی رعیت ہی کیوں نہ ہوں، وہ سب کے سب ''اہل جاہلیت'' ہونے کے فتوے کی زد میں ہیں۔

میں تو کہتا ہوں سوال کو ذرا اور پھیلایئے۔ آغازِ نبوتؐ سے لے کر ہجرتِ مدینہ تک نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے عالی مرتبت صحابہؓ جو ''اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'' کے خطاب کے مستحق بھی قرار پائے، کیا وہ کسی اس قسم کی حکومت میں رہتے تھے جس کا ذکر جناب قرضاوی نے اپنی تحریر میں کیا ہے؟ اور جب مشرکین مکّہ کے مظالم سے تنگ آ کر ان میں بہت سے اصحابِ عزیمت نے سرزمین حبشہ کی طرف ہجرت کی تو کیا وہاں قرآنی حکومت قائم تھی؟ بلکہ نبی ﷺ کی ہجرت سے قبل جن صحابہؓ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی یا جن صحابہؓ کو خود آنحضرت ﷺ نے اسلام کی دعوت پھیلانے اور مسلمان ہونے والوں کی تعلیم و تربیت کے لئے وہاں بھیجا، کیا ان کی ہجرت سے قبل ''قرآن کی رو سے حکومت کرنے والا کوئی امام'' وہاں موجود تھا؟

یقیناً جناب قرضاوی کی زیرِ تنقید عبارت اپنے عموم و شمول کے لحاظ سے ان تمام سوالات اور اعتراضات کا مورد قرار دی جا سکتی ہے مگر معترضین نے اس بات کی طرف ذرا بھی توجہ نہ دی کہ جناب قرضاوی درحقیقت مسلمانوں کو غلبۂ دین کی جدوجہد کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے ان کے سامنے اس خوفناک حقیقت کو واشگاف انداز میں بیان کر رہے ہیں کہ جو مسلمان قرآن کے مطابق قائم کسی حکومت کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو، اس کو اپنا ایمان بچانے کے لئے اور اہل جاہلیت میں شمار ہونے سے بچنے کے لئے اظہار (غلبہ) دین کی راہ میں سرگرم عمل ہونا چاہئے۔ پھر جدوجہد کے دوران اگر کسی بااختیار ''امام'' کی قیادت نصیب نہ بھی ہو تو اسے اپنے طور پر کسی شخص کو اس اجتماعی جدوجہد کے لئے اپنا قائد اور رہنما بنا لینا چاہئے۔ اور جب بھی کوئی ایسی سرزمین

میسر آ جائے جہاں لوگ صرف اللہ کی بندگی کرنے کے لئے آزاد ہوں تو ہر سچے مسلمان کو اس سرزمین کی طرف اسی طرح ہجرت کرنے کے لئے نکل کھڑے ہونا چاہئے' جس طرح ایک گمراہ معاشرے میں رہنے والا وہ مسلمان تھا جس کا ذکر ایک حدیث شریف میں تفصیل سے آیا ہے کہ وہ سو انسانوں کے قتل جیسے بھیانک جرم کے ارتکاب کے بعد ہجرت کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا مگر وہاں پہنچنے سے قبل اس کی مہلت عمل ختم ہوگئی اور راستے ہی میں فرشتۂ اجل آن پہنچا' تب اللہ تعالیٰ نے اس کے سابق گناہ معاف فرما کر اس کو اپنی رحمت اور مغفرت کے وسیع دامن میں پناہ لینے کا مستحق قرار دے دیا' جیسا کہ قرآن حکیم میں بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد موجود ہے:

﴿وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ (النساء: ۱۰۰)

''اور جو شخص اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف ہجرت کرنے کے لئے نکلے پھر اس کو (راستے ہی میں) موت آ جائے تو (اس کو معلوم رہنا چاہئے کہ) اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہو گیا اور اللہ تو بہت بخشنے والا مہربان ہے۔''

(چنانچہ ہجرت سے قبل کے گناہوں کے بارے میں اسے فکرمند نہ ہونا چاہئے)

ایک صحیح حدیث میں بھی اس طرح کی بشارت موجود ہے:

((وَالْهِجْرَةُ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا))

''ہجرت ان (گناہوں) کو منہدم کر دیتی ہے' جن کا ارتکاب (ہجرت سے) پہلے کیا گیا تھا۔''

اصل مسئلہ مسلمانوں کو ان کے ملی منصب اور مقصدِ حیات کی طرف دعوت دینا اور اس راہ میں سرگرم کرنا ہے' تکفیر اور جاہلیت کی موت کی قانونی اور فقہی بحث نہیں ہے۔

میرے اس بیان پر اگر یہ اعتراض اٹھایا جائے کہ دنیا میں ایک ارب سے زائد مسلمانوں میں ان لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے جو ''اظہارِ دین'' کے فرض کو پہچان کر اس کی ادائیگی کے لئے تھوڑی بہت جدوجہد بھی کر رہے ہیں تو باقی مسلمانوں کے بارے میں شیخ قرضاوی کے اس فتوے کی روشنی میں کیا حکم لگایا

جائے گا' تو میں آپ کے اس سوال نما اعتراض کو غلط نہیں بلکہ برمحل سمجھوں گا۔ لیکن فتوے کی جو کاٹ آپ مسلمانوں کے خلاف محسوس کر رہے ہیں اور جس کاٹ کو کند کرنے کے درپے ہیں' آپ اسی کاٹ تک کیوں محدود رہتے ہیں؟ دنیا میں مسلمانوں کے علاوہ جو انسان بستے ہیں کیا وہ اللہ کے بندے اور آدمؑ کی اولاد نہیں؟ کیا یہ سب قرآن وسنت کی نصوص کے مطابق کافر ومشرک نہیں اور کیا اس حالت میں ان میں سے جو لاکھوں لوگ روزانہ فوت ہوتے ہیں' وہ کتاب وسنت کے فتوے کی زد میں نہیں؟ لہٰذا آپ ان نصوص کی کاٹ کی وسعت اور شدت کی طرف بھی توجہ فرمائیں اور ان لاکھوں انسانوں کو جہنم کا ایندھن بننے سے بھی تو بچائیں۔ مگر آپ کی اس خواہش کے علی الرغم اللہ تعالیٰ کا ارشاد تو یہ ہے کہ جو انسان غفلت میں چوپایوں کے مانند ہیں ان کے بارے میں وہ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ قطعاً فکرمند نہیں ہے۔ یہ ''سارا جہاں'' جس کا ہے اگر اس کا فیصلہ ان کے بارے وہ ہے جو درج ذیل آیت کریمہ میں بیان کیا گیا ہے تو پھر آخر ہم کیوں ''فکر جہاں'' میں خود کو گھلائیں۔ مالکِ جہاں کا فیصلہ ملاحظہ ہو:

﴿وَلَقَدۡ ذَرَاۡنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيۡرًا مِّنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ‌ۖ لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ بِهَا وَلَهُمۡ اَعۡيُنٌ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ بِهَا وَلَهُمۡ اٰذَانٌ لَّا يَسۡمَعُوۡنَ بِهَا‌ؕ اُولٰٓـئِكَ كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ‌ؕ اُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡغٰفِلُوۡنَ۝﴾ (الاعراف: ۱۷۹)

''اور یقیناً ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے بہتوں کو پیدا ہی جہنم کے لئے کیا ہے۔ ان کے پاس دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں' ان کے پاس آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں' ان کے پاس کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ یہ لوگ تو چوپایوں جیسے ہیں' بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں۔ یہی لوگ غفلت میں گم ہیں۔''

تاہم اپنے بندوں کے بارے میں ان کے ربّ کی مشیت یا فیصلہ کچھ بھی ہوا اور کچھ بھی ہوسکتا ہے' کسی کو اس کے بارے میں اعتراض کرنے کا حق نہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿لَا يُسۡـَٔلُ عَمَّا يَفۡعَلُ وَهُمۡ يُسۡـَٔـلُوۡنَ۝﴾ (الانبیاء: ۲۳)

''جو کچھ وہ کرتا ہے اس کے بارے میں اس سے کوئی سوال نہیں کیا جاتا۔ (البتہ) ان (انسانوں) سے (ان کے اعمال کے بارے میں) سوال کیا

جائے گا۔''

مگر ہم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم اس کی مخلوق کو' جہاں تک ہم سے ہو سکے' جہنم میں گرنے سے بچائیں۔ چنانچہ اُمت مسلمہ کو ان سب انسانوں کے مفاد کے لئے اٹھایا گیا ہے کہ وہ ان کو خیر کی طرف آنے کی دعوت دے اور جہاں اس کا بس چلے وہاں ایسا معاشرہ وجود میں لائے جس کے اندر معروف کا حکم دیا جاتا ہو اور منکر سے روکا جاتا ہو' تاکہ ایسا ماحول پیدا ہو جائے جس کے اندر لوگ ''خیر'' کو بآسانی پہچان کر اسے قبول کر لیں اور فکر و عقیدے کی گمراہیوں سے خود اپنے اختیار کے تحت الگ ہو جائیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝﴾ (آل عمران: ۱۰۴)

''اور تمہارے اندر ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خیر کی طرف دعوت دے' نیکی کا حکم دے اور برائی سے روک دے اور یہی جماعت فلاح پانے والی ہے۔''

مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ اُمت کو اس اہتمام اور انتظام کی ہدایت فرمائی گئی ہے جو اعتصام بحبل اللہ پر قائم رہنے اور لوگوں کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے یہ ہدایت ہوئی ہے کہ مسلمان اپنے اندر سے ایک گروہ کو اس کام پر مقرر کریں۔ وہ لوگوں کو نیکی اور بھلائی کی دعوت دے' معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔ معروف و منکر سے مراد شریعت اور سوسائٹی دونوں کے معروفات و منکرات ہیں اور ان کے لئے امر و نہی کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کا غالب قرینہ یہی ہے کہ یہ کام مجرد وعظ و تلقین ہی سے نہیں انجام دینا ہے بلکہ اختیار و قوت سے اس کو نافذ بھی کرنا ہے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ یہ گروہ اُمت کی طرف سے سیاسی اقتدار کا حامل ہو۔ اگر تنہا دعوت و تبلیغ ہی سے یہ کام لینا مدنظر ہوتا تو اس مطلب کو ادا کرنے کے لئے ''يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ'' کے الفاظ کافی تھے' يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ (الآیۃ) کی ضرورت نہ تھی۔''

(تدبر قرآن' ج ۲' ص ۱۵۴' ۱۵۵)

ہمارے نزدیک اس آیت سے اس اُمت کے اندر خلافت کے قیام کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے نبی ﷺ کی وفات کے بعد پہلا جو کام کیا وہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا قیام تھا۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے استاذ اور مایہ ناز مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے فریضۂ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی وضاحت کرتے ہوئے آیت: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰) یعنی ''تم وہ بہترین اُمت ہو جس کو (تمام) لوگوں کے فائدے کے لئے نکالا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو'' کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اس سے معاملے کی اصل حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ عمل صالح کریں' پھر ادائے حقوق کے بارے میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور چونکہ ادائے حقوق بغیر خلافت وسیاست ناممکن ہے اس لئے ضروری ہے کہ خلافت قائم کریں۔''

(مجموعۂ تفاسیر فراہیؒ' ص۳۴۴)

مگر ہمارے اس مکتب فکر کے علما اور دانش ور مدعی ہیں کہ خلافت قائم کرنے کی کوشش کرنا مسلمانوں پر فرض نہیں ہے۔ ہاں! اگر سیاسی اقتدار حاصل ہو ہی جائے تو مسلمان اپنے میں سے کچھ لوگوں کو اس کام پر بھی مقرر کریں۔ چنانچہ ان کے ایک قائد لکھتے ہیں کہ:

> ''دعوت کی دوسری صورت وہ ہے کہ جس کا حکم سورۂ آل عمران کی آیت: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ میں آیا ہے۔ اس حکم کا تعلق اربابِ اقتدار سے ہے۔ اہل ایمان کے لئے ان کے پروردگار نے یہ بات لازم ٹھہرائی ہے کہ انہیں اگر کسی زمین میں سیاسی خودمختاری حاصل ہو جائے تو وہ اپنے اندر سے ایک گروہ کو اس کام پر مقرر کریں کہ وہ لوگوں کو خیر کی طرف بلائے' برائی سے روکے اور بھلائی کا حکم دے۔'' (قانونِ دعوت' ص۱۵)

گویا سیاسی خودمختاری کے حصول کی جدوجہد یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام کے لئے کسی کوشش کی ذمہ داری اُمت پر نہیں ہے۔ البتہ کسی منصوبے اور عملی جدوجہد کے بغیر اللہ تعالیٰ اگر (تکوینی) قدرت کے تحت مسلمانوں کو اقتدار عطا کر ہی دے تب مسلمان امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لئے ایک گروہ کو مقرر کر دیں اور بس ان کی ذمہ داری ختم۔

اس مکتب فکر کے علمبرداروں کے نزدیک دنیا کے تمام چھوٹے بڑے کاموں میں سے ایک سیاسی خودمختاری اور باطل پرستوں سے اقتدار چھیننے کا کام وہ واحد کام ہے کہ جس کے لئے نہ کسی منصوبے کی ضرورت ہے نہ کسی جدوجہد کی۔ یہ چیز تو بس جب اللہ چاہے گا تب خودبخود حاصل ہو جائے گی۔

پھر قرآنی آیت کی تاویل کرتے ہوئے قانونِ دعوت کے مصنف نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری کو اربابِ اقتدار سے متعلق قرار دے کر اس باب میں عام مسلمانوں کی صرف یہ ذمہ داری بتائی ہے کہ اگر ان کو کہیں سے سیاسی خودمختاری مل جائے تو وہ اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے اپنے اندر سے ایک گروہ مقرر کر دیں، لیکن جس حدیث میں اس کام کو عمومیت کے ساتھ ہر مسلمان کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے، اس حدیث کا ترجمہ انہوں نے اس طرح کیا ہے کہ حتی الوسع یہ ذمہ داری ''بے ضرر، معصوم اور کم آزار'' بن کر رہ جائے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''رسول اللہ ﷺ نے اہل ایمان کی یہ ذمہ داری اس طرح واضح کی ہے: مَنْ رَّاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ (مسلم، کتاب الایمان) یعنی ''تم میں سے جو شخص اپنے دائرۂ اختیار میں کوئی برائی دیکھے اسے چاہئے کہ وہ ہاتھ سے اس کا ازالہ کر دے، پھر اگر اس کی ہمت نہ ہو تو زبان سے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو دل سے اسے ناگوار سمجھے اور یہ ایمان کا ادنیٰ ترین درجہ ہے''۔

(قانونِ دعوت، ص ۱۱۴)

اس ترجمے میں جناب مترجم نے فَلْیُغَیِّرْہُ کا ترجمہ ایک جگہ ''ازالہ کر دے'' کیا

ہے اور دوسری جگہ ''ناگوار سمجھے'' کیا ہے اور تیسری جگہ اور کوئی بات نہ بنی تو سرے سے ترجمے میں اسے غائب ہی کر دیا ہے۔ حالانکہ تغیر کے معنی ''ازالہ'' کرنا یا ''ناگوار سمجھنا'' نہیں بلکہ ایک چیز کو بدل کر اس کی جگہ دوسری چیز کو قائم کرنا ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ''منکر'' کو ہٹا کر معروف کو اس کی جگہ قائم کر دینا اصلی ذمہ داری ہے۔ پھر چونکہ ہر شخص کے بارے میں یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ وہ منکر کو مٹا کر اس کی جگہ معروف کو قائم کر دے اس لئے حدیث شریف میں استثنا کے ذریعے گنجائش پیدا کی گئی کہ جو ایسا نہ کر سکے (فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ)، لیکن جناب مترجم نے استطاعت (طاقت رکھنے) کو ہمت سے بدل کر اس کا ترجمہ ''پھر اگر اس کی ہمت نہ ہو'' کر دیا جو نہ صرف بالکل غلط ہے بلکہ خود مترجم نے اپنے ترجمے میں ''اپنے دائرہ اختیار میں'' کی جو قید فرض کر لی تھی اس صورت میں ''ہمت کا نہ ہونا'' مطلقاً کوئی وجہ جواز بن ہی نہیں سکتا۔ جو کام کسی کے دائرہ اختیار میں ہو اس کو کرنے کی ہمت نہ ہونا ایک بے معنی سی بات ہے۔ پھر فَبِقَلْبِہٖ چونکہ فَلْیُغَیِّرْہُ سے متعلق ہے اس لئے اس کے معنی دل سے اس کو بدلنا (یا بدلنے کا عزم رکھنا) ہوں گے نہ کہ محض ناگوار سمجھنا۔

اس نوعیت کی ایک آواز بھارت سے بھی اٹھ رہی ہے اور اسلام کے عالمی مشن کی اسی طرح کی تاویلات کر کے اسلام کی دعوت کو غیر مسلموں کی نظروں میں اتنا معصوم اور بے ضرر بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اب بھارت میں ہندو ان کو اپنی مذہبی کتھاؤں میں اسلام کی اس بے ضرر دعوت کا بھاشن دینے کے لئے بلانے لگے ہیں۔ ''تعبیر کی غلطی'' کے مصنف نے بزعم خود ثابت کیا ہے کہ ''اقامت دین'' کا مطلب دین کو قائم کرنا، تعبیر کی غلطی ہے۔ اس کی صحیح تعبیر دین کو سیدھا رکھنا یعنی اس پر ٹھیک ٹھیک طریقے پر عمل کرنا ہے۔ اسی طرح دین کو غالب کرنے کے جس کام کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہوا ہے: ''لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ'' وہ مسلمانوں کی ذمہ داری نہیں کہ جس کے لئے وہ سرگرم عمل ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کو اپنا کام بتایا ہے۔ چنانچہ وہی اس کام کو اپنی قدرت کاملہ سے انجام دے دے گا۔

اسی طرح ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (الحدید:۲۵) میں بعثت انبیا کا مقصد لوگوں کا انصاف پر قائم ہونا جو بتایا گیا ہے اور ﴿كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (النساء:۱۳۵) یا ﴿كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾ (المائدہ:۸) انصاف کو لے کر اٹھنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے (یا) اللہ کے لئے اٹھنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو' اسی طرح مظلومین کو ظلم سے بچانے کے لئے قتال کا حکم اور دین کے مکمل طور پر اللہ کے لئے ہو جانے تک قتال کرنے کا حکم وغیرہ' بے شمار احکام کو تاویل کی خراد پر چڑھا کر اس مکتب فکر نے اسلام کو بھکشوؤں کا مذہب بنانے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔

یہ حضرات کہتے ہیں کہ ہمارا کام صرف دعوت پہنچانا اور آخرت کے عذاب سے ڈرانا ہے اور جب تک کوئی ہماری اس دعوت میں رکاوٹ نہ بنے اور ہمیں اس دعوت و انذار سے بذریعہ طاقت نہ روکے ہم کو طاقت استعمال کرنے کا حکم نہیں ہے۔ لیکن کوئی ان سے یہ پوچھے کہ اگر آپ کی دعوت مترفین کی اطاعت چھوڑ کر رسولوں کی اطاعت اختیار کرنا نہیں ہے' اگر آپ کی دعوت غیر اللہ کی بندگی چھوڑ کر اللہ کی بندگی اختیار کرنا نہیں ہے' اگر آپ کی دعوت غیر اللہ کی حاکمیت کا انکار کر کے صرف اللہ کی حاکمیت کے سامنے سر اطاعت جھکانا نہیں ہے تو آپ سے لڑنے آئے گا کون؟ اور آئے گا تو کیوں لڑنے آئے گا؟ لیکن اگر آپ کی دعوت فی الواقع وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام کی تھی تو اس کو سمجھ لینے کے بعد آپ کی اس دعوت کو ٹھنڈے پیٹوں بھلا کون برداشت کرے گا؟

(بشکریہ: ماہنامہ ترجمان القرآن' اکتوبر ۲۰۰۲ء)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

''اسلام اور موسیقی''

بعض حامیانِ موسیقی کے پیدا کردہ شبہات کا ازالہ

ازقلم: مولانا عبدالغفار حسن حفظہ اللہ

اس سلسلۂ مضامین کی ترتیب میں مشہور شارحین حدیث اور امام ابنِ تیمیہؒ اور ان کے ارشد تلامذہ کی تصانیف سے استفادہ کیا گیا ہے۔

زیادہ تر ایسی احادیث کی تشریح کو ملحوظ رکھا گیا ہے:

۱) جن سے اسلام کے بنیادی عقائد و اقدار پر روشنی پڑتی ہو۔

۲) جن روایات سے تعمیر سیرت اور دینی تربیت کا پہلو نمایاں ہو۔

۳) ایسی روایات کی صحیح اور معقول تشریح جن کو قرآن یا عقل و تجربہ کے خلاف قرار دے کر ردّ کر دیا جاتا ہے۔

۴) ایسی روایات کی صحیح تاویل و تشریح جو بظاہر متعارض اور متصادم معلوم ہوتی ہیں۔

۵) ایسی روایات و آثار کی وضاحت جو اپنے ظاہری مفہوم کے لحاظ سے حدیث کی حجیت اور اہمیت کو کم کرتی ہوں۔

۶) ایسی احادیث کی مستند توضیح جن کو آج کے اصحابِ تجدد مغربی ثقافت کو فروغ دینے کے لئے غلط معنی پہناتے ہیں۔ (ع۔ح)

حَدَّثَنَا عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنِ غنم الاشعری قَالَ حَدَّثَنِیْ اَبُوْ عَامِرٍ اَوْ اَبُوْ مَالِکٍ الْاَشْعَرِیُّ وَاللّٰہِ مَا کَذَبَنِیْ سَمِعَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وسَلَّم یَقُوْلُ: ((لَیَکُوْنَنَّ مِنْ اُمَّتِیْ اَقْوَامٌ یَسْتَحِلُّوْنَ الْحِرَّ وَالْحَرِیْرَ وَالْخمر وَالْمَعَازِفَ وَلَیَنْزِلَنَّ اَقْوَامٌ اِلٰی جَنْبِ عَلَمٍ یَرُوْحُ عَلَیْهِمْ بِسَارِحَةٍ لَهُمْ یَأْتِیْهِمْ یَعْنِی الْفَقِیْرَ لِحَاجَةٍ فَیَقُوْلُوْنَ ارْجِعْ اِلَیْنَا غَدًا فَیُبَیِّتُهُمُ اللّٰہُ وَیَضَعُ

الْعَلَمِ وَيَسْمَخُ آخَرِينَ قِرَدَةً وَخَنَازِيرَ اِلٰی يَوْمِ الْقِيَامَةِ)) (صحيح البخاری' كتاب الاشربة' باب ما جاء فيمن يستحل الخمر و يسميه بغير اسمه)

ابو عامرؓ یا ابو مالکؓ (یہ دونوں صحابی ہیں) کے شاگرد عبدالرحمٰن بن غنم الاشعری کا بیان ہے کہ مجھ سے (ان دونوں میں سے ایک نے) حدیث بیان کی' بخدا انہوں نے مجھ سے جھوٹ بات نہیں کی۔ انہوں نے آنحضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: ''میری اُمت میں ایسے لوگ (یا گروہ) پیدا ہوں گے جو زنا' ریشم' شراب اور گانے بجانے کے آلات کو حلال قرار دیں گے اور کچھ لوگ پہاڑ کے دامن میں اتریں گے جہاں ان کے پاس شام کو مویشی چر کر پہنچیں گے' ان کے پاس کوئی آدمی اپنی کسی ضرورت و حاجت کو لے کر آئے گا تو وہ کہیں گے کہ ''کل آنا'' تو اللہ تعالیٰ ان کو راتوں رات عذاب میں مبتلا کر دے گا' پہاڑ ان پر گرا دے گا اور دوسروں کو قیامت تک لئے بندر اور سور بنا دے گا''۔

تحقیق سند

بخاری کی اس روایت کو حافظ ابنِ حزم کے سوا تمام قابلِ ذکر اہلِ علم محدثین اور فقہاء نے صحیح تسلیم کیا ہے۔ علامہ عینیؒ لکھتے ہیں:

والحديث صحيح و ان كانت صورته صورة التعليق وقد تقرر عند الحفاظ ان الذی ياتی به البخاری من التعاليق كلها بصيغة الجزم يكون صحيحا الی من علقة عنه ولو لم يكن من شيوخه فان قلت قال ابن حزم هذا الحديث منقطع فيما بين البخاری و صدقة بن خالد و المنقطع لا تقوم به حجة. قلت وهم ابن حزم فی هذا

(عمدة القاری' شرح البخاری' كتاب الاشربة' ج ۲۱' ص ۱۷۵)

''حدیث (یعنی حدیث معازف) صحیح ہے' اگرچہ بظاہر معلق صورت میں ہے' کیونکہ حفاظِ حدیث کے ہاں یہ بات طے شدہ ہے کہ بخاری میں جتنی معلق(۱) روایات جزم و یقین کے ساتھ منقول ہیں وہ قابلِ اعتماد ہیں اور جن سے تعلیق

---

۱) محدثین کی اصطلاح میں معلق روایت اسے کہتے ہیں جس کی سند کا ابتدائی حصہ یا پوری سند حذف کر دی جائے۔ صحیح بخاری کی ایسی معلق روایات متصل السند کے حکم میں مانی جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو مقدمہ مشکوٰۃ' ص ۴' از شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ۔

کی گئی ہے ان کی طرف حدیث کی نسبت درست ہے' خواہ وہ امام بخاری کے شیوخ میں سے نہ بھی ہوں۔ اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ امام بخاری اور صدقہ بن خالد کے درمیان انقطاع پایا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ منقطع روایت حجت نہیں ہوسکتی تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں انقطاع کا شبہ پیدا کرنا وہم سے خالی نہیں ہے۔ یعنی یہ شبہ بے بنیاد ہے۔''

حافظ ابن الصلاح ؒ نے بھی ابن حزم ؒ کے اس موقف کو انتہائی کمزور قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

فزعم ابن حزم انه منقطع بين البخارى وهشام و جعله جوابا عن الاحتجاج به على تحريم المعازف واخطأ فى ذلك من وجوه والحديث صحيح معروف الاتصال على شرط الصحيح

''ابن حزم ؒ نے بخاری کی اس روایت کو منقطع قرار دے کر حرمت معازف و مزامیر کے استدلال کا جواب دینا چاہا ہے' حالانکہ حدیث بخاری ؒ کی شرط کے مطابق صحیح اور متصل الاسناد ہے۔ ابنِ حزم نے اس دعوائے انقطاع میں کئی وجوہ سے غلطی کی ہے۔''

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ ابن الصلاح' ص ۳۲) حافظ ابن القیم ؒ نے اس شبہ کا جواب تفصیل کے ساتھ دیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ شبہ کئی وجوہ کی بنا پر بے بنیاد ہے۔

۱) امام بخاری کی ملاقات اور سماع ہشام بن عمار سے ثابت ہے' اس لئے یہاں تدلیس کا شبہ پیدا کرنا کسی صورت میں بھی ممکن نہیں ہے۔

۲) امام بخاری کا صیغہ تمریض ''قیل'' کے بجائے پورے وثوق کے ساتھ اس روایت کو بیان کرنا ظاہر کرتا ہے کہ ان کو اِس روایت کی صحت پر پوری طرح یقین ہے۔

۳) امام اسماعیلی اور دوسرے محدثین نے دوسرے طرق سے سند کا اتصال واضح کر دیا ہے جس سے انقطاع کا شبہ کسی صورت میں بھی باقی نہیں رہتا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو **اغاثة اللهفان فى مكائد الشيطان**' ص ۱۳۹۔ حافظ ابن حجر ؒ نے فتح الباری میں اس سلسلہ میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ (فتح الباری مصری' ج ۱۰' ص ۴۴' کتاب الاشربۃ۔)

اس موقع پر یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ حافظ ابنِ حزم ؒ کا اپنی رائے پر اصرار وتشدد اہلِ علم کے طبقہ میں معروف ومشہور ہے۔ اسی تشدد کی بنا پر وہ متعدد مسائل میں دوسرے اہلِ علم سے منفرد ہو گئے ہیں' اس لئے ایک فرد کا اختلاف وشذوذ جب کہ اس کی بنیاد کسی معقول استدلال پر بھی نہیں ہے' کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس تفصیل کے بعد اس قول کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی کہ ''معازف ومزامیر کی حرمت پر کوئی حدیث بھی صحیح نہیں ہے''۔

الفاظِ حدیث کی تحقیق

۱) **حِر (بالحاء والراء المخففة)**: فرج' شرمگاہ' یہاں مراد زنا ہے' بعض راویوں نے خزّ (بالخاء والزاء) روایت کیا ہے' یہ بھی ریشم کی ایک قسم ہے۔ (**اغاثة اللهفان**' ص۱۴۰) لیکن لفظ ''حِــــر'' پر راویانِ حدیث نے زیادہ اعتماد کیا ہے اور اسی کو ترجیح دی ہے۔ یہاں سیاق وسباق کے لحاظ سے بھی یہی مناسب ہے۔ (فتح الباری' ج۱۰' ص۴۵)

۲) **معازف**: یہ لفظ معزفة کی جمع ہے۔ اس کا اطلاق گانے بجانے کے آلات پر کیا جاتا ہے۔ لغتِ حدیث کے عالم ابن الاثیر نے لکھا ہے: **وهی الدفوف و غیرها مما یضرب** یعنی دف اور جن آلات کو بجایا جاتا ہے ان کو معازف کہا جاتا ہے۔ مولانا وحید الزمان صاحب مرحوم لکھتے ہیں: **یستحلون الحر والمعازف** 'یعنی زنا اور باجوں کو حلال سمجھیں گے۔ (**انوار اللغة**[۲] ج۱۸' ص۱۰۴) حافظ ابنِ حجر ''معازف'' کی تشریح میں لکھتے ہیں:

> **هی آلات الملاهی' ونقل القرطبی عن الجوهری ان المعازف هو الغناء والذی من صحاحه انها آلات اللهو** (فتح الباری مصری' ج۱۰ ص ٤٥)
>
> ''یعنی معازف آلاتِ لہو کا نام ہے۔ امام قرطبی نے جوہری سے نقل کیا ہے کہ معازف غناء کا نام ہے۔ صحاح جوہری میں معازف آلاتِ لہو کے معنی میں لیا

---

۲) واضح رہے کہ یہ لغت' عربی کی مستند لغات لسان العرب' قاموس' نہایہ ابن الاثیر' مجمع البحار' صحاح جوہری' الفائق اور منتہی الادب سے مرتب کی گئی ہے۔

گیا ہے۔''

مذکورہ بالا تشریحات میں صرف تعبیر کا اختلاف ہے۔ معازف سے اصل گانے بجانے کے آلات مراد ہیں۔ اور ایک تشریح کے مطابق غناء (گانے) پر بھی اس کا اطلاق کیا گیا ہے۔

۳) یَسْتَحِلُّوْنَ : استحلال کے معنی ہیں کسی چیز کو حلال قرار دینا' یعنی ایک تو گناہ کرنا پھر اس کو حلال وطیب سمجھنا۔ یہ دین سے بغاوت کی انتہائی افسوس ناک شکل ہے۔ اس سے جرم کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ آج کل صورتِ حال یہی ہے کہ جس چیز کو شریعت میں حرام ٹھہرایا گیا ہے اس کو بہ تکلف جائز اور حلال قرار دیا جا رہا ہے۔

تشریح حدیث

۱) زنا' ریشم (۴)' شراب اور آلاتِ طرب وغناء حرام ہیں۔ اوّل الذکر تینوں محرمات کے بارے میں ابھی تک کوئی ایسا شوشہ نہیں چھوڑا جا رہا ہے جس سے یہ اُمور بھی متنازع فیہ مسائل کی حیثیت اختیار کر جائیں' اس لئے اس مضمون میں صرف معازف ومزامیر کی حلت وحرمت ہی تک گفتگو محدود رکھی جاتی ہے۔

۲) اس روایت میں جن چار چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں باہمی خاص تعلق اور مناسبت پائی جاتی ہے۔ یہ چاروں اشیاء تعیش پسند معاشرے کے ناگزیر لوازمات میں سے ہیں۔

موسیقی کے نتائج

جب کسی سوسائٹی کے افراد کو تن آسانی اور عیش پسندی کا چسکہ پڑ جاتا ہے تو بدن نرم ونازک ریشمی لباس مانگتا ہے' کان حسین ودلکش نغمے سننا چاہتے ہیں' دل ودماغ نشہ آور اور مدہوش کر دینے والے مشروبات کا مطالبہ کرتے ہیں' نگاہیں حسین چہروں کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔ اس ''ذوقِ جمالیات'' یا بالفاظِ دیگر ذہنی آوارگی اور اخلاقی بے

---

۴) ریشم مَردوں کے لئے حرام ہے اور عورتوں کے لئے مباح ہے' جیسا کہ دوسری روایات میں وضاحت موجود ہے۔

راہ روی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنی خواہشوں کے پیچھے پیچھے اسی منزل پر پہنچ جاتا ہے جسے آزاد محبت (Free Love) کہا جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے زنا اور بدکاری کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ جس قوم میں یہ بیماری پھیل جاتی ہے وہ روحانی' اخلاقی اور جسمانی ہر لحاظ سے تباہی و بربادی کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ حدیث میں ہے: ((مَا فَشَا الزِّنَا فِيْ قَوْمٍ قَطُّ اِلاَّ كَثُرَ فِيْهِمُ الْمَوْتُ)) (موطا امام مالک) یعنی جس قوم میں زنا کاری عام ہو جاتی ہے اس کی شرح اموات میں بھی بالآخر اضافہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ اسی بنا پر صلحائے اُمت کی اصطلاح میں غناء کو ''رقیة الزنا'' کہا جاتا ہے' یعنی غناء زنا اور بدکاری کا افسوں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حدیث میں غناء کو نفاق کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں: ((اِنَّ الْغِنَاءَ يُنْبِتُ النِّفَاقَ فِي الْقَلْبِ)) (ابوداؤد مع عون' ج ۴' ص ۴۳۵)

ابوداؤد کی اس روایت کے بارے میں محدثین کا فیصلہ اگرچہ یہ ہے کہ اس کا مرفوع (ارشادِ نبوی) ہونے کے بجائے حدیث موقوف یعنی قولِ صحابی ہونا زیادہ راجح ہے' تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ محدثین کے نزدیک ایسی موقوف روایت جس میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہو مرفوع کے حکم میں ہوتی ہے۔ علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں: **وهو في حكم المرفوع اذ مثله لايقال من قبل الرأى** (روح المعانی' ج ۲۱' ص ۶۰) شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں:

> ''آنحضرت ﷺ کی احادیث کا ہم تک پہنچنا ان روایات پر موقوف ہے جو سندِ متصل یا عنعنہ کے ذریعہ منقول ہوں' قطع نظر اس سے کہ وہ خود آنحضرت ﷺ کے الفاظ ہوں جن کو حدیث مرفوع کہتے ہیں یا کسی صحابی پر جا کر روایت ختم ہو جاتی ہو جسے حدیث موقوف کہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ اس قسم کی خبریں ہوں جو صحابہ اور تابعین کی جماعت میں سے ان قابل سند اشخاص سے منقول ہوں جن کے متعلق یہ یقین ہو کہ جب تک انہوں نے رسولِ خدا ﷺ سے اس بارے میں نہ سنا ہو وہ ازخود کہنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ حدیث موقوف بھی بطریق دلالت آنحضرت ﷺ ہی

کا قول ہے۔'' (حجۃ اللہ البالغۃ' ج ا' ص ۱۰۵)

زنا اور نفاق قلب کے مریض ہونے کی نشانی ہیں' اور ظاہر ہے کہ غناء زنا کے مبادی اور محرکات میں شمار ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اس حدیث میں ان دونوں کو یکجا بیان کر دیا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح سورۂ نور میں زنا کی حد اور ستر کے احکام بیان کرنے کے معاً بعد نفاق اور منافقین کے خصائص بتائے گئے ہیں' یا جیسے سورۂ احزاب میں حجاب کے احکام کے ساتھ ساتھ منافقین کا بھی ذکر موجود ہے۔

غنا اور زنا میں مناسبت

غناء اور زنا کی باہمی گہری مناسبت اور ان کے تلازم کو امام ابن الجوزیؒ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''گانے میں دو مضرتیں جمع ہیں' ایک طرف تو وہ قلب کو عظمتِ الٰہی میں تفکر سے روکتا ہے' دوسری طرف اسے مادّی لذتوں کی طرف راغب کرتا ہے۔ اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ تمام مادّی لذتیں حاصل کر لی جائیں' اور معلوم ہے کہ مادّی لذتوں میں سب سے زیادہ قوی مرد اور عورت کے اختلاط کی لذت ہے۔ مگر یہ لذت اُس وقت مکمل ہوتی ہے جب اس میں تجدد و تنوع ہوتا رہے' اور ظاہر ہے کہ حلال طریقے پر یہ تجدّد ممکن نہیں' لہٰذا گانا زنا کی ترغیب دیتا ہے۔ گانے اور زنا میں گہری مناسبت ہے' گانا روح کے لئے فتنہ ہے اور زنا نفس کی سب سے بڑی لذت ہے''۔

(تلبیس ابلیس' ص ۳۲۷' رسالۃ السماع والرقص' مؤلفہ امام ابن تیمیہ' ص ۴۰۶)

خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث میں زنا اور اس کے اسباب و محرکات کو یکجا بیان کر دیا گیا ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس قوم میں عیش پسندی' مزامیر پرستی' شراب خوری اور زنا کاری پھیل جاتی ہے اس پر مختلف قسم کے انتہائی شدید عذاب نازل ہو سکتے ہیں' جن کا ایک نمونہ قومِ لوط اپنے زمانہ میں دیکھ چکی ہے۔

ابن ماجہ کی روایت میں غناء اور سماع کا انجام اس طرح بیان کیا گیا ہے:

((لَیَشْرَبَنَّ نَاسٌ مِنْ اُمَّتِی الْخَمْرَ یُسَمُّوْنَهَا بِغَیْرِ اسْمِهَا' یُعْزَفُ عَلٰی

رُءُوْسِهِمْ بِالْمَعَازِفِ وَالْمُغَنِّيَاتِ، يَخْسِفُ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ وَيَجْعَلُ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ)) (ابن ماجه، کتاب الفتن)

''میری اُمت میں سے کچھ لوگ شراب کا دوسرا نام رکھ کر اس کا دور چلائیں گے، ان کے سروں پر گانے والیوں اور باجوں گاجوں کا شور اور ہنگامہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں دھنسا دے گا اور ان میں سے بعض کو بندر اور سور بنا دے گا۔''

ایک غلط تاویل

بخاری کی زیرِ غور حدیث کی بعض حامیانِ موسیقی نے یہ تاویل کی ہے:

''اس سے انکار نہیں کہ آنحضور ﷺ دف[۴] بجانے پر خاموش رہے، خود اسے سنا اور منع نہیں فرمایا، جیسا کہ صحیح بخاری میں موجود ہے۔ اس بات کا زیرِ بحث حدیث میں احتمال موجود ہے کہ جن معازف (باجوں) کو حرام کیا گیا ہے وہ وہی باجے ہیں جو مے نوشی کے ساتھ پیوستہ ہوں، جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ میری اُمت میں کچھ لوگ شراب پئیں گے، شام کو ان کے پاس گانے والی لونڈیاں آئیں گی اور دن کو باجے بجیں گے''۔

''اس روایت میں اس کا احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد ان تمام چیزوں کی مجموعی شکل ہو۔ اس صورت میں کسی ایک چیز کی انفرادی تحریم کی دلیل نہ ہوگی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت قرآن کی یہ آیات ہیں: ''اسے پکڑ کر گلے میں طوق ڈالو، پھر اسے جہنم میں لے جاؤ، پھر ستر گز کے حلقے والی زنجیر میں اسے جکڑ دو۔ یہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور مسکین کے کھلانے پر کسی کو ابھارتا نہ تھا''۔ یہاں بلاشبہ اس وعید شدید کا سبب محض مسکین کو کھلانے پر نہ ابھارنا نہیں ہے اور نہ ایسا کرنا یعنی مسکین کو کھلانے پر نہ ابھارنا حرام ہے''۔

(اسلام اور موسیقی، ص ۱۷۷، شائع کردہ ثقافت اسلامیہ)

اس تاویل کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی محفل میں غناء اور مزامیر کا استعمال ہو اور شراب کا دور نہ چلے تو ایسی مجلس سے لطف اندوز ہونا جائز ہوگا۔ حقیقت میں یہ ایک قسم کا مغالطہ ہے۔ جس حدیث کی بنا پر یہ تاویل کی گئی ہے اس کا منشا تو صرف عیش و طرب کی دلدادہ سوسائٹی کی حالت بیان کرنا ہے۔ بالعموم جہاں گانے بجانے کی گرم بازاری ہو

---

۴) اس حدیث کی وضاحت عنقریب قارئین کرام کے سامنے آ جائے گی۔

گی وہاں شراب وکباب کا دَور بھی چل کرر ہے گا اور جنسی بے راہ روی کی وبا بھی پھوٹ کرر ہے گی۔ اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ مزامیر کے ساتھ اگر شراب نہ ہو گی تو مزامیر و معازف حرام نہ ہوں گے۔ اس قسم کی تاویل کا جواب قاضی شوکانیؒ نے نیل الاوطار میں نقل کیا ہے:

ویجاب بان الاقتران لا یدل علی ان المحرم ھو الجمع فقط والالزم ان الزنا المصرح بہ فی الحدیث لا یحرم الا عند شرب الخمر واستعمال المعازف واللازم باطل بالاجماع فالملزوم مثلہ وایضاً یلزم فی مثل قولہ تعالیٰ ﴿انّہٗ کانَ لَا یُؤْمِنُ باللّٰہِ الْعَظِیْمِ وَلا یَحُضُّ علیٰ طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ﴾ انہ لا یحرم عدم الایمان باللّٰہ الا عند عدم الحض علی اطعام المسکین فان قیل تحریم مثل ھذہ الامور المذکورۃ فی الالزام قد علم من دلیل آخر فیجاب بان تحریم المعازف قد علم من دلیل آخر کما سلف. (ج ٧ ص ٣١٨)

''اس تاویل کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ چند چیزوں کے یکجا بیان ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حرمت کا اطلاق صرف مجموعی حالت پر ہو ورنہ لازم آئے گا کہ زنا بھی اسی وقت حرام ہو جب کہ اس کے ساتھ شرب خمر اور استعمال مزامیر کا سلسلہ بھی جاری ہو۔ یہ نتیجہ بالاجماع غلط ہے تو ظاہر ہے کہ اصل دعویٰ بھی باطل ہوگا۔ نیز اس تاویل کی رو سے یہ بھی لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ پر عدم ایمان اسی وقت حرام ہوگا جب کہ انسان مسکین کو کھانا کھلانے پر بھی نہ ابھارے یعنی بخل کا بھی ارتکاب کرے۔ اگر اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ ان چیزوں کی حرمت تو دوسرے دلائل سے واضح ہو چکی ہے تو عرض کیا جائے گا (جناب!) اسی طرح معازف و مزامیر کی حرمت بھی دوسری دلیل سے معلوم ہو چکی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔''

اسی طرح قرآن میں جہاں شراب کو رِجس (ناپاک) کہا گیا ہے وہاں ساتھ ہی مَیْسَر (قمار بازی) کا بھی ذکر ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ

فَاجْتَنِبُوْهُ......﴾ (المائدۃ: ۹۰)

''پس شراب' جوا' اَنصاب (بُت) اور اَزلام (فال دیکھنے کے تیر) ناپاک شیطانی کارنامہ ہی ہیں' ان سے پرہیز کرو۔''

کیا اس آیت کی یہ تفسیر درست ہو گی کہ جوا صرف اسی وقت ناپاک اور قابلِ اجتناب ہو گا جب کہ اس کے ساتھ مےنوشی کا شوق بھی فرمایا جائے؟ باقی رہا یہ کہنا کہ مسکین کے کھانا کھلانے پر نہ ابھارنا کوئی حرام کام نہیں ہے کہ جس پر اتنی شدید وعید سنائی جائے' اصل معاملہ یہ ہے کہ جس وقت کوئی انسان فاقہ مست ہو' بھوک سے مر رہا ہو تو ایسے موقع پر جو نہ خود آمادۂ جود و کرم ہو اور نہ دوسروں ہی کو اس نیکی پر ابھارے وہ یقیناً انتہائی شدید وعید کا مستحق ہے۔ اسی کے ہم معنی وہ آیت ہے جس میں سرمایہ کو کنز بنانے اور تجوریوں پر ہر وقت قفل چڑھانے والوں کو دردناک عذاب کی بشارت سنائی گئی ہے۔ (سورۃ التوبہ' آیت ۳۴'۳۵)

حرمت مزامیر پر دوسری روایات

صحیح بخاری کی مذکورہ بالا قابل اعتماد روایت کے علاوہ ابوداوٗد' ترمذی' ابن ماجہ' مسند احمد' طبرانی وغیرہ میں بے شمار ایسی احادیث ہیں جن سے معازف و مزامیر کی حرمت واضح طور پر ثابت ہوتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ ان روایات کی اکثریت پر محدثین نے جرح کی ہے' لیکن مجموعی طور پر یہ سب احادیث ایک دوسرے کی تقویت اور تائید کا ذریعہ بنتی ہیں(۵) اور اس بنا پر یہ روایات قابل اعتماد اور لائق استناد باور کی گئی ہیں۔ قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں:

''مجموعی طور پر یہ روایات استدلال کی بنیاد بن سکتی ہیں' خصوصاً جب کہ ان میں

۵) واضح رہے کہ ایسی ضعیف روایات جن کا تمام تر مدار ایسے ناقابل اعتماد راویوں پر ہو جو محض حافظہ کے لحاظ سے ہی کمزور نہ ہوں بلکہ ان کو کاذب یا متہم بالکذب بھی قرار دیا گیا ہو' اگر وہ بیسیوں کی تعداد میں بھی ہوں تب بھی لائق استناد نہ ہوں گی' لیکن اگر راویوں پر صرف ضعف حافظہ کا الزام ہو تو اس صورت میں ایسی روایات کا مجموعہ حسن قرار دیا جائے گا اور شرعی مسائل میں ان کو حجت مانا جائے گا۔ (مقدمہ ابن الصلاح' ص ۱۷' مقدمہ مشکوٰۃ' ص ۵)

سے بعض روایات کو 'حسن' تسلیم کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ تمام روایات مجموعی طور پر کم از کم حسن لغیرہ تو شمار ہوں گی' یعنی فی نفسہٖ صحت کے لحاظ سے معیار بلند نہ سہی مجموعی طور پر لائق استناد بن جاتی ہیں''۔

اس کے بعد قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں:

''گانے والی لونڈیوں کی بیع کی ممانعت پر مشتمل روایات متعدد سندوں سے ثابت ہیں۔ اسی طرح: ((اَلْغِنَاءُ یُنْبِتُ النِّفَاقَ)) (گانا نفاق پیدا کرتا ہے) یہ روایت بھی متعدد سندوں اور طریقوں سے مروی ہے''۔ (نیل الاوطار' ج ۷' ص ۱۲)

سنن ابی داؤد کی روایت

صحاحِ ستہ کی مشہور کتاب سنن ابی داؤد کی روایت ہے:

عَنْ نَافِعٍ قَالَ: سَمِعَ ابْنُ عُمَرَ مِزْمَارًا قَالَ فَوَضَعَ اِصْبَعَیْهِ عَلٰی اُذُنَیْهِ ..... وَقَالَ: كُنْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَسَمِعَ مِثْلَ هٰذَا فَصَنَعَ مِثْلَ هٰذَا

(ابو داؤد' کتاب الادب)

''نافعؒ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) نے بانسری کی آواز سنی تو آپ نے اپنے کان انگلیوں سے بند کر لئے ..... اور فرمایا: میں (ایک بار) آنحضور ﷺ کے ہمراہ تھا' آپؐ نے اسی طرح آواز سنی اور یہی طرزِ عمل اختیار کیا''۔

اس روایت کو امام ابوداؤد نے منکر قرار دیا ہے' لیکن منکر ہونے کی وجہ کوئی بیان نہیں کی۔ سنن ابی داؤد کی مشہور مستند شرح عون المعبود میں لکھا ہے:

''اس روایت کے منکر قرار دیئے جانے کی وجہ معلوم نہ ہو سکی' اس کے تمام راوی ثقہ ہیں' اس حدیث کا کوئی راوی بھی اپنے سے کسی ثقہ تر راوی کا مخالف نہیں ہے۔ امام سیوطیؒ نے ابن عبدالہادی کا قول نقل کیا ہے کہ اس روایت کو سلیمان بن موسیٰ کی وجہ سے محمد بن طاہر نے ضعیف قرار دیا ہے' حالانکہ سلیمان بن موسیٰ کو متعدد اہل علم نے ثقہ اور حسن الحدیث راویوں میں شمار کیا ہے' پھر اس کی متابعت و تائید میں مسند ابویعلیٰ اور طبرانی کی روایات موجود ہیں''۔

(عون المعبود' ج ۴' ص ۴۳۵)

ایک ضروری وضاحت

آنحضرت ﷺ اور حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) کے بانسری کی آواز سن کر کان بند کر لینے سے مقصود صرف شدید نفرت اور ناپسندیدگی کا اظہار تھا۔ اس قسم کے مواقع پر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لینا کچھ ضروری نہیں ہے۔ اصل میں کان لگا کر سننا منع ہے۔ اگر اتفاقاً گانے بجانے کی آواز کان میں پڑ جائے تو اس سے گناہ لازم نہیں آتا۔ جس طرح کہ نامحرم عورت پر اچانک بلا ارادہ نگاہ پڑ جائے تو خدا کے ہاں کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا' لیکن بالقصد اور بالارادہ تاک جھانک کرنا قطعاً حرام ہے' اس پر شدید وعید آئی ہے اور اسے آنکھ کا زنا قرار دیا گیا ہے۔

چند کمزور سہارے

مذکورہ بالا صفحات میں سنت رسول ﷺ کی واضح تصریحات سے یہ دکھلانا مقصود تھا کہ اسلام میں معازف ومزامیر کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اب ان دلائل وشواہد کا تجزیہ کیا جاتا ہے جو حامیانِ موسیقی کی طرف سے معازف ومزامیر کے جواز بلکہ ''مستحب اور مستحسن'' ہونے پر پیش کئے جاتے ہیں۔

قرآن سے استدلال: قرآن میں ہے: ﴿وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا﴾ اس آیت کی تشریح اور تائید میں بائبل میں سے زبور کی یہ عبارت پیش کی گئی ہے:

> ''نرسنگے کی آواز کے ساتھ اس کی حمد کرو۔ بربط اور ستار پر اس کی حمد کرو' تاردار سازوں اور بانسری کے ساتھ اس کی حمد کرو' زور سے جھنجھناتی جھانجھ کے ساتھ اس کی حمد کرو''۔ (زبور' باب ۱۵' آیت ۳ تا ۵)

اس سے انکار نہیں کہ موجودہ بائبل میں بہت سی حکمت ودانائی کی باتیں پائی جاتی ہیں' لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ صحیح روایات وآثار سے جن چیزوں کی کراہیت و حرمت ثابت ہو چکی ہے ان کو بائبل کی روایات کی بنا پر جائز بلکہ سنت داؤدی قرار دے دیا جائے۔ اگر یہ دروازہ ایک مرتبہ کھول دیا گیا تو رہزنی' شراب نوشی' قمار بازی' زناکاری اور بُت پرستی سب کے جواز کا فتویٰ بھی دینا ہوگا' کیونکہ موجودہ بائبل میں تو نعوذ

باللہ نوح علیہ السلام' لوط علیہ السلام' ہارون علیہ السلام' داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف ان اخلاقی جرائم اور سیاہ کاریوں کو بھی منسوب کیا گیا ہے۔ حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو: بائبل' کتاب پیدائش' باب ۶' ۱۹' کتاب خروج' باب ۳۴' سموئیل' کتاب ۲' باب ۱۱' کتاب سلاطین' باب ۱۱' یوحنا' باب ۱۰۔

حدیث کا سہارا: صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو خوش الحانی کے ساتھ قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا:

((یَاابَا مُوْسٰی لَقَدْ اُعْطِیْتَ مِزْمَارًا مِّنْ مَزَامِیْرِ آلِ دَاوٗدَ))

''اے ابوموسیٰ! تمہیں آلِ داؤد کے مزامیر میں سے مزمار عطا ہوا ہے۔''

اس حدیث کی تشریح میں ایک صاحب کہتے ہیں: ''اس سے مراد تلاوت کا ایسا انداز ہے جس میں موسیقیت کی جھلک ہو' کچھ سُر ہو' کچھ لے ہو' اس کے لئے ایک جامع لفظ 'تغنی' ہے''۔ لیکن اگر یہ تشریح صحیح ہے تو کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ لیجئے مزمار کا ثبوت بھی سنتِ داؤدیؑ اور سنتِ محمدیؐ دونوں سے مل گیا۔

حقیقت میں نہ یہاں ''تغنی''[۶] ہے نہ موسیقیت اور نہ راگ الاپنے کی حمایت' اس سے تو صرف حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی مؤثر اور پُرکشش خوش الحانی کا اظہار و اعتراف مقصود ہے۔ جیسا کہ ایک روایت میں آتا ہے: ((اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا)) ''بلاشبہ کچھ بیان و خطاب جادو کا سا اثر رکھتے ہیں''۔ کیا اس تشبیہ کی بنا پر اس سے سحر و ساحری کا جواز نکالا جا سکتا ہے؟

روایات کا سہارا: معازف و مزامیر اور گانے بجانے کی حمایت میں بخاری کی بھی دو روایتیں پیش کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ:

۶) حضرت داؤد علیہ السلام کو موسیقار اور مغنی ثابت کرنے کے لئے مصنف عبدالرزاق وغیرہ کی روایات ہی پیش کی گئی ہیں' لیکن مصنف عبدالرزاق جیسی کتابوں کا شمار تیسرے طبقے میں ہوتا ہے۔ اس طبقے کا سرمایۂ حدیث ہر قسم کی رطب و یابس اور غث و سمین روایات سے بھرپور ہوتا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ) ظاہر ہے کہ صحاح ستہ کی جن احادیث سے حرمت معازف و مزامیر ثابت ہوتی ہے ان کے مقابلہ میں ان کا کیا وزن ہو سکتا ہے!

''حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور میرے ہاں تشریف لائے۔اس وقت دو لڑکیاں جنگِ بعاث کے گانے گا رہی تھیں، حضور ﷺ بستر پر لیٹ گئے اور دوسری طرف کروٹ لے لی اور چہرۂ مبارک پھیر لیا۔اتنے میں حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے اور مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں یہ شیطانی گیت؟ آنحضور ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا: ''ان کو رہنے دو، یہ عید کا دن ہے۔''

اس روایت میں چند اُمور تنقیح طلب ہیں: (ا) غناء اور تغنی کے معنی (ب) جاریہ کا مفہوم (ج) اشعار کی نوعیت (د) حضرت ابوبکرؓ کے ٹوکنے اور منع کرنے کی بنیاد۔

(الف) ''غنا'' یا ''تغنّی'' محض گانے ہی کے لئے نہیں آتے بلکہ بلند آواز سے خوش الحانی کے ساتھ پڑھنے کے معنی میں بھی آتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے:

((مَا اَذِنَ اللّٰهُ لِشَيْ ءٍ مَا اَذِنَ لِنَبِيّ يَتَغَنّٰى بِالْقُرْآنِ))

(مشکوٰۃ، ج ۱، ص ۱۹۰ بحوالہ بخاری و مسلم)

''اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو اتنی توجہ سے نہیں سنا جتنی توجہ سے نبی (ﷺ) کو خوش الحانی سے قرآن پڑھتے ہوئے سنا۔''

ایک اور حدیث میں ہے:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ)) (مشکوٰۃ، ص ۱۹۰، بحوالہ بخاری)

''جس نے قرآن کو خوش الحانی سے نہیں پڑھا وہ ہم میں سے نہیں۔''

اسی حدیث کی تشریح میں امام شافعیؒ نے کہا ہے کہ اس سے مراد تحسین قراءت ہے، اسی کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے:

((زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِاَصْوَاتِكُمْ)) (مشکوٰۃ، ص ۱۹۱، بحوالہ ابو دائود)

''قرآن کو اپنی آوازوں سے زینت دو''۔

ان احادیث کی تشریح میں ابن الاثیر لکھتے ہیں: کل من رفع صوته و والاه فصوته عند العرب غناء ''عربوں کے نزدیک بلند آواز سے تسلسل کے ساتھ پڑھنے کو غنا کہا جاتا ہے۔'' یہی ابن الاثیر زیر بحث حدیث کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''وَعِنْدِیْ جَارِيَتَانِ تُغَنِّيَانِ بِغِنَاءِ بُعَاثٍ'' ای تنشد ان الاشعار التی قیلت

یوم بعاث ولم نرد الغناء المعروف بین اھل اللھو واللعب و قد رخص عمر فی غناء الاعراب وھو صوت کالحداء

"عِندِیْ جَارِیَتَانِ تُغَنِّیَانِ" کا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں نوعمر لڑکیاں وہ اشعار پڑھ رہی تھیں جو جنگِ بعاث کے موقع پر (شجاعت و بہادری کے اظہار کے لئے) کہے گئے تھے' اس سے وہ گانا مراد نہیں ہے جو لہو ولعب کے رسیا لوگوں کے ہاں رائج ہے۔ حضرت عمرؓ نے بدوؤں کو بھی غناء کی اجازت دی تھی' وہ بھی حدی خوانی کی طرح ایک آواز ہے"۔ (نہایۃ' ج ۲' ص ۱۷۳)

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

"از صحیح بخاری بعد از تغنیان گفتہ اند ولیستا بمغنیتین' یعنی غناء میکردند ذات آنہا مغنی نبود کہ غناء حرفت آنہا باشد وغنارا خوب توانند گفت ومشہور ومعروف بداں باشند وتشویق بفاحشہ وتعریض بہوا کنند کہ داعی بفتنہ وفساد بود بلکہ دختر کان بودند از اہل خانہ چنانکہ درخانہ ہا چیزے میگویند" (اشعۃ اللمعات' شرح مشکوٰۃ' ج ۱' ص ۶۴۰)

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ دو لڑکیاں گھر میں جنگ کے بہادرانہ کارناموں پر مشتمل اشعار پڑھا کرتی تھیں' لیکن وہ پیشہ ور مغنیہ نہ تھیں۔ ان میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جو عشق ومحبت کے جذبات کو بھڑکانے والی ہو یا کسی فتنہ وفساد کا موجب بنے۔ افسوس ہے کہ "ثقافت" کے مقالہ نگار نے یہ حدیث تو نقل کر دی لیکن "لیستا بمغنیتین" کے الفاظ نظر انداز کر گئے۔ علمی تحقیقات کے میدان میں اصحابِ علم کو اس قسم کے مشکوک طرزِ عمل سے بالاتر ہونا ضروری ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ غناء یا تغنی کے دو معنی ہیں: (۱) بلند آواز سے خوش الحانی کے ساتھ اشعار پڑھنا۔ (۲) فنِ موسیقی کے قواعد کے مطابق آواز کے اتار چڑھاؤ کے کرتب کا پُرتکلف مظاہرہ کرنا۔ شریعتِ اسلامی نے جس چیز کو گوارا کیا ہے وہ پہلا مفہوم ہے۔ آخر الذکر معنی کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ پھر اس کے ساتھ اگر ساز بھی شامل ہو جائے' (چاہے سوز ہو یا نہ ہو) تو اس کے شرابِ دوآتشہ بننے میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی۔

''تغنّی'' کی طرح قرآن میں لفظ ''تزکیہ'' ملتا ہے' اس کے دو مفہوم ہیں:

(۱) پاک بننا' پاک بازی اختیار کرنا۔ (۲) پاک کہلانا اور نیکی اور پارسائی کا مظاہرہ کرنا۔ پہلے مفہوم کو مقامِ مدح میں بیان کیا گیا' جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا﴾ ''فلاح پائی جس نے نفس کو پاک کیا''۔ لیکن دوسرے معنی کو اپنانے سے روکا گیا ہے' فرمایا: ﴿لَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ﴾ ''اپنی پاکبازی کی نمائش نہ کرو''۔

(ب) لفظ ''جاریہ'' کی تشریح میں علامہ عینی لکھتے ہیں: الجارية في النّساء كالغلام في الرّجال و يقال على من دون البلوغ منهما (عمدة القاری' شرح بخاری' ص ۲۶۸) ''عورتوں میں جاریہ نابالغ بچی کو کہتے ہیں جس طرح غلام کا لفظ مردوں میں نابالغ لڑکے پر بولا جاتا ہے''۔

(ج) اشعۃ اللّمعات کی مذکورہ بالا عبارت سے ان اشعار کی نوعیت بھی معلوم ہوگئی جو یہ لڑکیاں پڑھ رہی تھیں' ان میں کوئی بھی ایسی بات نہ تھی جو سفلی جذبات کے لئے ہیجان انگیز ہوتی' جیسا کہ آج کل موسیقی کی محفلوں اور کانفرنسوں میں ہوتا ہے اور جن کے جواز کے لئے قرآن و حدیث سے دلائل جمع کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

(د) حضرت ابوبکرؓ کا اس موقع پر ٹوکنا ظاہر کرتا ہے کہ ان کو اتنی احتیاط ملحوظ تھی کہ بلند آواز سے اجتماعی رنگ میں اشعار پڑھنا پڑھانا بھی ان کو گوارا نہ ہوا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ پہلے سے انہوں نے زبانِ رسالت سے غناء کی مذمت سنی ہوگی تب ہی تو انہوں نے اسے مزمور الشیطان کہہ کر تنبیہ فرمائی۔ نیز رسول اللہ ﷺ کا حضرت ابوبکرؓ کے مزمور الشیطان کہنے پر سکوت اختیار کرنا ظاہر کرتا ہے کہ آپ ﷺ کے نزدیک بھی اس قسم کا مشغلہ پسندیدہ نہ تھا...... اس حدیث کی تشریح میں علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں:

> ''حضرت ابوبکرؓ کا اس موقع پر ٹوکنا ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے اس سے پہلے غناء کی مذمت آنحضور ﷺ سے سنی ہوگی' جس کی بنا پر ان کا خیال تھا کہ یہ ممانعت عمومی طور پر ہر موقع کے لئے ہے۔ آنحضور ﷺ نے اپنے ارشاد سے واضح کر دیا کہ عید جیسے خوشی کے مواقع پر اس قسم کے تفریحی مشغلے پر قدغن لگانا اور

تشدد برتنا مناسب نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح رہے کہ آپ کا اعراض
اور بے التفاتی ظاہر کر رہی ہے کہ گھر کے ذمہ داروں اور بزرگوں کو ایسے مشاغل
سے بالاتر رہنا ہی بہتر ہے''۔ (تفسیر روح المعانی' ج ۲۱' ص ٦٣)

صحابہؓ کے طرزِ عمل کی وضاحت

''تغنی'' کی مذکورہ بالا تشریح کے بعد ان روایات کا مفہوم بھی واضح ہو گیا جن میں بعض صحابہ کرام مثلاً حضرت عمرؓ اور حضرت براء بن مالکؓ وغیرہ کی طرف تغنی کی نسبت کی گئی ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ مذکورہ بالا حدیث سے خوشی کے مواقع پر خوش آوازی سے اچھے مضمون کے اشعار اگر گھر کی لڑکیاں پڑھ لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح شادی بیاہ کے موقع پر اگر گھر کی لڑکیاں اعلان اور خوشی کے اظہار کے لئے دف بھی استعمال کر لیں تو اسے گوارا کیا جا سکتا ہے' جیسا کہ دوسری روایت سے ظاہر ہے۔

امام ابن تیمیہؒ کی تصریح

مذکورہ بالا احادیث کی تصریح کرتے ہوئے امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

''ہاں' آپؐ نے شادی وغیرہ میں عورتوں کو دف بجانے کی اجازت دی ہے'
رہے مرد تو آپ کے زمانہ میں کوئی مرد بھی نہ ڈھول بجاتا تھا نہ تالیاں پیٹتا تھا''۔

بلکہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: تالی بجانا (یعنی دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کی پشت پر مارنا) عورتوں کے لئے اور تسبیح یعنی سبحان اللہ کہنا مردوں کے لئے ہے (یعنی اگر امام نماز میں بھول جائے اور اس کو متنبہ کرنا ہو تو مرد سبحان اللہ کہیں اور عورتیں مذکورہ بالا کیفیت کے ساتھ متنبہ کر دیں۔) بلکہ آپؐ نے مردوں سے مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں پر اور عورتوں سے مشابہت اختیار کرنے والے مردوں پر لعنت کی ہے۔

اس حدیث (یعنی زیرِ بحث روایت) سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے اصحابؓ اس قسم کے سماع کے عادی نہ تھے' اسی لئے حضرت ابوبکرؓ نے اسے

شیطان کی آواز قرار دیا۔ نبی ﷺ نے لڑکیوں کو ان کے حال پر اس لئے رہنے دیا تھا کہ وہ عید کا دن تھا اور بچوں کو ایسے موقع پر کھیل کود کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تا کہ مشرکین جان لیں کہ ہمارے دین میں آسانی ہے'' اور معلوم ہے کہ حضرت عائشہؓ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ (رسالہ وجد وسماع' ص ۲۶)

ایک ضروری وضاحت

روایات میں شادی بیاہ کے موقع پر زیادہ سے زیادہ دف بجانے کا جواز نکلتا ہے' تا کہ اس طرح اعلان سے نکاح اور زنا کے درمیان امتیاز ہو سکے۔ اب یہ اسلامی مزاج کے یکسر خلاف ہو گا کہ دف پر قیاس کر کے دوسرے ہر قسم کے باجے اور آلاتِ طرب جائز ٹھہرا لئے جائیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو خارش کی بنا پر ریشمی لباس کی اجازت دی گئی تھی۔ اب کوئی اور ''ثقافت'' کے بزرگ عام حالات میں بھی مَردوں کے لئے اس کے جواز کا فتویٰ دے دیں تو کیا یہ انصاف کے مطابق ہو گا؟ جس طرح دین میں تنگی ممنوع ہے اسی طرح اس قسم کا توسع اور تجدد بھی جائز نہیں ہے جس سے دین میں تحریف کا دروازہ کھل جائے۔

یہ بھی واضح رہے کہ عرب میں بعثتِ نبوی ﷺ کے وقت دف کے علاوہ دوسرے آلاتِ طرب بھی رائج تھے' جیسا کہ عربی زبان کی مستند لغات اور ادبی لٹریچر سے معلوم ہوتا ہے' لیکن آنحضور ﷺ کے زمانہ مبارک میں مسلمانوں سے صرف دف کا استعمال ہی منقول ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس پاک معاشرے میں خوشی کے مواقع پر بھی تفریح کی رنگا رنگی اور بوقلمونی درست نہیں سمجھی جاتی تھی۔

فقہاء کا یہ اصول کتنا حکیمانہ ہے کہ وہ احادیث جو اقوالِ نبویؐ پر مشتمل ہیں' ان کی حیثیت عام قانون کی سی ہو گی' اور واقعاتی روایات صرف اپنے مندرجات ہی میں محدود رہیں گی' عموم واطلاق کے لحاظ سے ان کا وہ درجہ نہ ہو گا جو قولی احادیث کو حاصل

ہے۔قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں: لانّ الفعل لا عموم له' (ارشادالفحول' ص ۳۶)

اسلاف میں سے بعض اہلِ علم شادی بیاہ کے مواقع پر بھی دف کو مکروہ سمجھتے ہیں' اس طرزِ عمل کی بنیاد شریعت کا وہ ضابطہ ہے جسے ''سدِ بابِ ذریعہ'' کہا جاتا ہے' یعنی بعض مباحات پر اس وجہ سے پابندی لگا دی جاتی ہے کہ اس سے معاشرہ میں حرام مشاغل کے نشوونما پانے کے لئے چور دروازے کھل سکتے ہیں۔ جیسے آپس میں ہدیئے' تحفے دینا لینا مسنون ہے' لیکن کسی سرکاری افسر یا جس سے قرض لیا ہو' اس کو تحفے دینا یا اس کی خدمت میں ڈالیاں پیش کرنا جائز نہیں ہے' کیونکہ اس طرح رشوت اور سود کے لئے راستہ ہموار ہو جاتا ہے اور معاشرے کی اجتماعی زندگی فساد اور انتشار کا نشانہ بن جاتی ہے۔ اسی طرح نامحرم عورت کے حسن و جمال سے لطف اندوز ہونا اور حسین چہروں کو قصداً دیکھنا بھی ممنوع ہے' کیونکہ اس سے زنا اور بدکاری کے جراثیم معاشرے میں پھیلتے ہیں' حالانکہ اس موقع پر کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نظارہ بازی سے ہم خدا کی قدرت اور اس کی صنعتِ خالقیت کا مشاہدہ کرتے ہیں (اور اس طرح ایمان و عرفان کو تازگی اور قلب و روح کو نئی زندگی حاصل ہو جاتی ہے)۔

(اعلام الموقعین' ج ۲' ص ۶۴' از علامہ ابن قیم)

چند شبہات اور ان کا ازالہ

موسیقی اور معازف و مزامیر کی حرمت پر چند شبہات بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ ذیل میں یہ شبہات مع جواب درج ہیں' تاکہ اس بحث کا کوئی پہلو بھی تشنہ اور نامکمل نہ رہنے پائے۔

۱) اگر واقعی معازف و مزامیر ایسی ہی شدید وعید کے موجب تھے تو ان کا ذکر قرآن میں کیوں نہیں آیا؟

۲) بعض صحابہؓ و تابعینؒ اور سلف صالحینؒ سے معازف کے استعمال یا سماعِ غناء کا ثبوت ملتا ہے' اس کی کیا توجیہہ کی جائے گی؟

گزشتہ صفحات میں صحیح بخاری کی روایت (جس میں گانے بجانے کے آلات کی مذمت ہے) کی تشریح کرتے ہوئے ان احادیث کا مفہوم متعین کیا گیا تھا جن سے گانے بجانے کو ''سنتِ نبوی'' ثابت کیا جاتا ہے۔ ذیل میں اس شبہ کا ازالہ مقصود ہے کہ اس قسم کے مسائل میں قرآن خاموش ہے، محض حدیث کی بنا پر کسی شے کی حرمت و حلت کا فتویٰ کیسے دیا جا سکتا ہے؟ اوّلاً تو یہ موقف ہی غلط ہے کہ جس چیز کے بارے میں قرآن بظاہر خاموش ہو اُس کی حلت و حرمت کا فتویٰ سنت کی بنا پر نہیں دیا جا سکتا۔ یہ الگ مستقل موضوع ہے، اس پر تفصیلی گفتگو کسی دوسرے موقع پر ہو سکتی ہے۔ یہاں موضوع کی مناسبت کے لحاظ سے صرف اتنا بتلانا مقصود ہے کہ قرآن مجید نے حلت و حرمت کے ایسے واضح اصول اور ضابطے مقرر کر دیئے ہیں کہ ان کی روشنی میں معازف و مزامیر کی حلت و حرمت کا فیصلہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

سورۂ لقمان کے شروع میں پہلے ان لوگوں کی صفات بیان کی گئی ہیں جو قرآن مجید سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر ہے جو اپنے غلط قسم کے مشاغل کی بنا پر قرآنی ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝﴾ (لقمان:٦)

''بعض آدمی ایسے بھی ہیں جو ''لہو الحدیث'' خریدتے ہیں تاکہ بغیر کسی دلیل کے خدا کی راہ سے بھٹکائیں اور اسے مذاق بنائیں۔ یہ لوگ ہیں جن کے لئے رسوا کن عذاب ہے''۔

''لہو'' کے معنی امام راغب اصفہانی کی تحقیق کے مطابق یہ ہیں:

اللّهو ما يشغل الانسان عما يعنيه ويهمّه (مفردات راغب ص ۴۷۱)

''لہو ہر اُس شے کو کہتے ہیں جو انسان کو اس کے مقصد سے ہٹا دے۔''

امام شوکانیؒ لکھتے ہیں:

لهو الحديث كل ما يلهى من الخير من الغناء والملاهى والاحاديث

المکذوبة و کل ما هو منکر (تفسیر فتح القدیر ج۴ ص۲۶۲)

''لہوالحدیث سے مراد ہر وہ شے ہے جو نیک کاموں سے غافل کر دے۔ گانا بجانا' بے سروپا داستانیں اور ہر قسم کا منکر اس کے تحت آ سکتا ہے''۔

عام تجربہ اور مشاہدہ یہی ہے کہ جس قوم میں ''معازف ومزامیر'' (گانے بجانے کے آلات) نے مقبولیت حاصل کی وہ صراطِ مستقیم سے ہٹ کر فواحش و منکرات کے سیلاب سے نہ بچ سکی۔ اسی بنا پر اکثر صحابہ کرامؓ نے لہوالحدیث کی تفسیر میں غناء کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ سنتِ نبوی سے بھی اسی تفسیر کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

مشہور مفسر امام قرطبیؒ لکھتے ہیں:

انّ اولی ما قیل فی هذا الباب هو تفسیر لهو الحدیث بالغناء' قال و هو قول الصحابة و التابعین (تفسیر فتح القدیر' ج۴' ص۲۶۲)

''لہوالحدیث کی تفسیر میں جتنے بھی اقوال پائے جاتے ہیں ان میں سب سے راجح قول اس کا ہے جس نے لہوالحدیث سے غناء مراد لیا ہے' یہ صحابہ اور تابعین کا قول ہے۔''

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ ان تمام تفسیری اقوال میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں پایا جاتا' کیونکہ ان سب کا اصل مرکزی معنی وہی ہے جس کی وضاحت امام راغب اور امام شوکانی کی زبانی مذکورہ بالا سطور میں کی جا چکی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ''لہوالحدیث'' کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

هو الغناء ' والله الذی لا اله الا هو' یرددها ثلاثا (ابن کثیر' ج۳' ص۴۴۱)

''لہوالحدیث سے مراد غناء ہے' قسم ہے اُس ذات کی جس کے سوا کوئی الٰہ (معبود) نہیں ہے! یہ کلمہ حضرت عبداللہ نے تین بار فرمایا''۔

اس تفسیر و تشریح میں حضرت ابن مسعودؓ تنہا نہیں ہیں بلکہ مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ ' حضرت جابرؓ اور اکابر تابعین' عکرمہ' سعید بن جبیر' مجاہد' مکحول' عمرو بن شعیب اور حسن بصری (رحمہم اللہ) بھی ان کے ہم نوا ہیں۔

قرآن فہمی میں تفسیر صحابہ کو جو اہمیت حاصل ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

امام حاکم لکھتے ہیں:

ان تفسیر الصحابی الذی شهد الوحی والتنزیل عند الشیخین حدیث مسند (اغاثة اللّهفان ،ص۱۲۹)

''ایسے صحابی کی تفسیر جس نے وحی اور نزول قرآن کا زمانہ پایا ہو امام بخاری اور امام مسلم کے نزدیک مسند حدیث کے حکم میں ہے۔''

امام ابن القیمؒ لکھتے ہیں:

''بعد والوں کی بہ نسبت صحابہ کرامؓ کی تفسیر کو قبول کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔ قرآن ان کے سامنے نازل ہوا، وہ قرآن کے پہلے مخاطب تھے، رسول اللہ ﷺ کی قرآن کی قولی اور عملی تفسیر کا ان کی نگاہوں نے خود مشاہدہ کیا تھا، زبان کے لحاظ سے فصاحت و بلاغت میں جو اُن کا نمایاں مقام تھا اس کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس لئے بغیر کسی قوی دلیل کے ان کی تفسیر سے انحراف کیسے کیا جا سکتا ہے؟ (اغاثة اللهفان ،ص۱۲۹)

اس آیت کی وضاحت میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''لہو الحدیث'' کی حرمت اسی وقت ہوسکتی ہے جب کہ اضلال (گمراہ کرنا) مقصود ہو۔ کیونکہ قرآن میں ﴿لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ﴾ فرمایا گیا ہے، اب اگر محض تفریح نفس مقصود ہو تو اس صورت میں گانے بجانے کو حرام کیسے ٹھہرایا جا سکتا ہے؟

واضح رہے کہ ''لِيُضِلَّ'' میں ''لامِ علت'' بھی مانا جا سکتا ہے۔ یعنی لہو الحدیث اختیار کرنے کا اصل مقصود لوگوں کو گمراہ کرنا ہو۔ نیز اس لام کو ''لامِ عاقبت'' بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یعنی آخر کار نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ معازف ومزامیر کے شیدائی راہِ حق سے ہٹ کر ضلالت کی وادیوں میں خود بھی گم ہو جاتے ہیں اور دوسروں کی گمراہی اور بے راہ روی کا بھی باعث بنتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو جو لطف و سرور رقص و سرود کی محفلوں میں حاصل ہوتا ہے اس کا عشرِ عشیر بھی وہ قرآن اور ذکرِ الٰہی میں محسوس نہیں کرتے، بلکہ قرآن کی تلاوت ایسے لوگوں کے لئے انتہائی انقباض اور وحشت کا موجب بنتی ہے۔ حقیقت میں ان کا وہی حال ہوتا ہے جس کا نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں

کھینچا ہے:

﴿وَاِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِ اٰیٰتُنَا وَلّٰی مُسۡتَکۡبِرًا کَاَنۡ لَّمۡ یَسۡمَعۡہَا کَاَنَّ فِیۡۤ اُذُنَیۡہِ وَقۡرًا ۚ﴾ (لقمان:۷)

''جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ غرور و تکبر کرتا ہوا پلٹ جاتا ہے' گویا اس نے سنا ہی نہیں' جیسے اس کے دونوں کانوں میں بہرہ پن ہے۔''

سورۃ المدثر میں قرآن سے وحشت کی کیفیت یوں بیان کی گئی ہے:

﴿فَمَا لَہُمۡ عَنِ التَّذۡکِرَۃِ مُعۡرِضِیۡنَ ۙ کَاَنَّہُمۡ حُمُرٌ مُّسۡتَنۡفِرَۃٌ ۙ فَرَّتۡ مِنۡ قَسۡوَرَۃٍ ؕ﴾ (آیات ۴۹۔۵۱)

''ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ نصیحت سے اس طرح روگردانی کرتے ہیں کہ گویا وہ جنگلی گدھے ہیں جو کسی شیر کی صورت سے بدک کر بھاگ جاتے ہیں۔''

قرآن سے اعراض

امام ابن تیمیہؒ غناء اور سماع کے نقصان اور نفع کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لیکن ان کی مضرت نفع سے زیادہ ہی ہے' ٹھیک اسی طرح جس طرح شراب اور قمار میں لوگوں کے لئے بعض فائدے ہیں' مگر ان کا نقصان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لئے شریعت نے ان کی اجازت نہیں دی' اور یہ اس لئے کہ شریعت راجح مصلحت ہی کا لحاظ کرتی ہے۔ جس چیز میں مصلحت کا امکان قوی ہوتا ہے شریعت اسے مستحسن رکھتی ہے' لیکن جس میں نقصان کا احتمال زیادہ ہوتا ہے تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔''

اس کی مثال یوں ہے کہ کوئی شخص پانچ درہم چوری کرے اور پھر دو درہم خیرات کر ڈالے' تو خیرات کرنا اگرچہ نیک کام ہے مگر اس کی وجہ سے چوری مباح نہ ہو گی۔ یہی حال سماع اور غناء کا ہے' اس میں کبھی کوئی نفع بھی ہو سکتا ہے' مگر اس کی مضرت بہرحال نفع سے زیادہ ہی ہے۔ یہ نفس میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے' جذبات برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ جب اس کی چاٹ پڑ جاتی ہے تو آدمی کو قرآن کی تلاوت و سماع میں کوئی لذت محسوس نہیں ہوتی' بلکہ کبھی قرآن سے بیزاری ہو جاتی ہے' اس کا سماع نفس کے

لئے بارگراں بن جاتا ہے اور نفرت اور وحشت بڑھ جاتی ہے۔ جس طرح صادق مسلمانوں کی طبیعت پر تورات' انجیل اور اہلِ کتاب و صابئین کے علوم کی تحصیل گراں ہوتی ہے اسی طرح گانے بجانے کے دلدادہ کے لئے قرآن کی تلاوت و سماع میں گرانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس چیز کی یہی مضرت کیا کم ہے کہ آدمی کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے شغف باقی نہیں رہتا۔

کراہت و نفرت

چونکہ سماع سے وہ بات حاصل نہیں ہوتی جسے اللہ اور اس کا رسول ﷺ پسند کرتے ہیں' بلکہ اکثر اوقات اس سے وہ بات حاصل ہوتی ہے جسے اللہ اور اس کا رسول ناپسند کرتے ہیں' بلکہ اس سے نفرت رکھتے ہیں' اسی لئے سماع کا حکم نہ اللہ نے دیا نہ اس کے رسول نے' نہ سلف صالحین نے اور نہ مشائخ کرام نے۔

ممانعت کی وجہ

نفس پر آواز کا اثر اوقات و حالات کے اختلاف سے ہوا کرتا ہے' کبھی مسرت پیدا ہوتی ہے' کبھی غم کی کیفیت طاری ہوتی ہے' کبھی غصہ آ جاتا ہے' کبھی کوئی اور جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ سریلی اور رسیلی آواز بھی انسان کو اس طرح مست کر دیتی ہے جس طرح شراب سے مستی پیدا ہو جاتی ہے۔ مستی کے معنی یہ ہیں کہ نفس پر لذت اس درجہ حاوی ہو جائے کہ عقل و فہم باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی لذت جس کی موجودگی میں عقل و فہم غائب ہو جائے کوئی نفع نہیں پہنچا سکتی' بلکہ مضر ہوتی ہے' ذکرِ الٰہی اور نماز سے غافل کر دیتی ہے' عداوت اور پھوٹ پیدا کر دیا کرتی ہے۔

(رسالۃ الرقص والسماع' ص ۵۰)

اس موقع پر یہ حقیقت بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہنی چاہئے کہ قرآنِ مجید میں شراب اور جوئے کی حرمت بیان کرتے ہوئے اس کی علت اور وجہ یہ بتلائی گئی ہے کہ ان دونوں کے ذریعے شیطان انسانوں کے درمیان پھوٹ ڈالتا ہے' اللہ کی یاد اور نماز

سے روکتا ہے۔فرمایا:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطٰنُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۖ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ﴾ (المائدۃ: ۹۱)

''شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے درمیان دشمنی اور رنجش ڈلوادے' اور تمہیں خدا کی یاد اور نماز سے روک دے۔ پس کیا تم ان کاموں سے باز رہو گے (یا نہیں؟)''

غناء اور سماع کے جواز کے لئے جو استدلال پیش کیا گیا ہے کیا بعینہٖ وہ شراب اور جوئے کی حلت پر چسپاں نہیں ہو سکتا؟ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ شراب اور جوئے سے ہماری دلچسپی محض تفریحِ نفس کے لئے ہے' نہ کہ لوگوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے اور اللہ کی یاد سے روکنے کے لئے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ''لہو الحدیث'' یعنی غناء اور گانے بجانے کے آلات سے دلچسپی رفتہ رفتہ انسان کو راہِ حق سے ہٹا دیتی ہے اور آخر کار نتیجہ ضلال (گمراہ ہونے) اور اضلال النّاس (لوگوں کو گمراہ کرنے) کی شکل ہی میں نمودار ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ زیر بحث آیت میں ﴿لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللّٰهِ﴾ میں ''لامِ عاقبت'' ماننا بے بنیاد نہیں ہے' قرآن مجید سے اس کی مثال ملتی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بعد اُن کی والدہ نے ان کو صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا تھا۔ بعد میں فرعونیوں نے ان کو اٹھالیا۔قرآن مجید نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے:

﴿فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا ۗ﴾ (القصص: ۸)

''پس اسے (حضرت موسیٰؑ کو) فرعونیوں نے اٹھالیا تاکہ وہ ان کے لئے دشمنی اور غم کا باعث بنے۔''

اس آیت میں ''لامِ علت'' کسی صورت میں مراد نہیں ہو سکتا' یہاں ''لامِ عاقبت'' ہی مراد ہے' یعنی موسیٰ علیہ السلام کو اٹھانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ فرعونیوں کے لئے عداوت اور مصیبت کا موجب بن گئے۔

غناء اور معازف و مزامیر کی حرمت پر قرآنِ مجید کی دوسری آیات سے بھی اہلِ علم نے استدلال کیا ہے' لیکن اس موقع پر صرف اسی ایک آیت کی تشریح پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

دوسرا شبہ

بعض حامیانِ موسیقی صحابہ کرامؓ ' تابعینؒ اور سلف صالحینؒ کے ناموں کی ایک طویل فہرست پیش کرتے ہیں کہ ''یہ سب حضرات نہ صرف یہ کہ گانے بجانے کے حامی تھے بلکہ عملاً اس میں دلچسپی بھی لیا کرتے تھے' پھر دلچسپی بھی ایسی کہ بعض اوقات پوری رات اسی شغل میں گزار دیا کرتے تھے۔''

خیر القرون کا مسلک

لیکن اصل حقیقت وہی ہے جسے امام ابن تیمیہؒ نے پیش کیا ہے۔ تالیاں بجانا' گانا' ڈھول بجانا' بانسریاں بجانا' ایسی مجلسوں میں شریک ہونا اور اسے عبادت و دین سمجھنا اسلام سے نہیں ہے۔ نہ نبی ﷺ نے اس کی اجازت دی ہے' نہ آپ کے خلفاء نے اسے روا رکھا ہے' نہ مسلمانوں کے کسی امام نے اسے مستحسن قرار دیا ہے۔ دین داروں میں سے کسی نے بھی کبھی یہ فعل نہیں کیا' نہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں' نہ صحابہؓ کے زمانہ میں' نہ تابعینؒ کے زمانہ میں' نہ تبع تابعینؒ کے زمانہ میں' بلکہ خیر القرون میں کوئی مسلمان بھی اس قسم کے سماع میں کبھی شریک نہیں ہوا' نہ حجاز میں' نہ شام میں' نہ یمن میں' نہ عراق میں' نہ خراسان میں' نہ مغرب میں' نہ مصر میں' بلکہ یہ چیز سرے سے موجود ہی نہ تھی۔ تیسرے قرن میں یہ ایجاد کی گئی' اسی لئے امام شافعی نے اس کی نسبت فرمایا:

''بغداد میں مَیں ایسی چیز چھوڑ آیا ہوں جسے زندیقوں نے ایجاد کیا ہے۔''

(رسالہ وجد و سماع' ص ۱۷)

امام مالکؒ و اہلِ مدینہ کا طرزِ عمل

دوسری جگہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ:

''اسحاق بن موسیٰ نے امام مالک سے سوال کیا کہ اہلِ مدینہ کس قسم کے گانے کو مباح سمجھتے تھے۔ امام مالکؒ نے جواب دیا: ''یہ فعل ہمارے ہاں صرف فاسق ہی کرتے ہیں۔''

یہ تصریح ان کے مذہب کی کتابوں میں مشہور ومعروف ہے۔ اس کے بعد شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

''بعض لوگوں نے امام مالک کی نسبت کہا ہے کہ انہوں نے ستار اور سارنگی سے شغل کیا ہے۔ یہ ایک سخت تہمت ہے جو جاہلوں نے ایجاد کی ہے' یہ میں نے اس لئے بیان کر دیا کہ ابوعبدالرحمٰن سلمی اور محمد بن طاہر مقدسی نے اس باب میں بکثرت حکایات وآثار نقل کئے ہیں' جو لوگ علم صحیح اور احوالِ سلف سے واقف نہیں ہیں وہ ان کی تحریروں سے دھوکے میں پڑ سکتے ہیں۔''

سچی جھوٹی روایات

شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہؒ نے واضح طور پر لکھا ہے:

''شیخ ابوعبدالرحمٰن سلمی میں نیکی' زہد' دین اور تصوف تھا' مگر وہ اپنی کتابوں میں اپنے مقصود کے مطابق تمام غث وسمین اور رطب ویابس روایات جمع کر گئے ہیں' چنانچہ ان کی کتابوں میں ایسی باتیں بھی موجود ہیں جو دین میں نفع پہنچا سکتی ہیں اور ایسی باتیں بھی ہیں جو ناواقفوں کے لئے نقصان رساں بھی ہیں۔ بعض اہلِ علم نے ان کی روایت قبول کرنے میں تامل کیا ہے' حتیٰ کہ امام بیہقیؒ جب ان سے روایت کرتے تھے تو تصریح کر دیا کرتے تھے کہ یہ ابوعبدالرحمٰن نے ہمیں اپنی اصل کتاب سے سنایا ہے۔ محمد بن طاہر مقدسی اچھے محدث تھے' حدیث اور رجالِ حدیث سے پوری واقفیت رکھتے تھے' مگر اکثر متاخر محدثین اور اہلِ زہد کی طرح وہ بھی ہر غث وسمین کو جمع کر دیا کرتے تھے۔'' (رسالہ وجد وسماع' ص ۶۱)

واضح رہے کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے شائع کردہ بعض رسائل میں زیادہ تر انہی دونوں حضرات کی روایات پر اعتماد کیا گیا ہے۔ اتحاف السادۃ المتقین شرح احیاء علوم الدین کے مصنف مرتضٰی زبیدی کا سہارا بھی یہی روایات وآثار ہیں۔

عبداللہ بن جعفرؓ کی طرف بھی یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ وہ گانے بجانے

سے دلچسپی لیا کرتے تھے۔ اگر اس روایت کو کسی درجے میں درست مان لیا جائے تو اس کا جواب وہی ہے جو امام ابنِ تیمیہؒ نے دیا ہے:

''یہ کہنا اور بھی مضحکہ خیز ہے کہ فلاں فلاں ولی اللہ نے ایسا کیا ہے' اور اگر یہ صحیح ہو تو دوسرے بکثرت اولیاء نے اس کی مذمت کی ہے۔ ایک ولی اللہ دوسرے ولی اللہ پر اعتراض کر سکتا ہے۔ اولیاء اللہ میں باہمی جنگ بھی ہو چکی ہے۔ جنگ صفین میں جب طرفین کی فوجیں بڑھیں تو لوگوں نے کہا کہ جنتی جنتیوں سے لڑنے چلے ہیں ...... اگر ولی اللہ کسی مکروہ و ممنوع فعل کا مرتکب ہو تو اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ایسے ہفوات اور لغزشوں سے ولی اللہ اپنی ولایت سے محروم نہیں ہو جاتا؟ پھر یہ بھی ہرگز ثابت نہیں کہ اولیاء سلف میں سے کسی نے بھی ایسے بدعتی سماع میں شرکت کی ہو جو دلوں کو شدید فتنوں میں مبتلا کر دے۔'' (رسالہ وجد و سماع' ص ٦٠)

امام ابنِ تیمیہؒ کی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگِ جمل اور صفین میں صحابہؓ کی شرکت یہ معنی نہیں رکھتی کہ قتال بین المسلمین جائز ہے۔

اسی طرح بالفرض صحابہؓ میں سے اگر کسی صاحب نے غناء سے دلچسپی لی بھی ہے تو اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ قرآنی اصول' قابل اعتماد احادیث اور جمہور صحابہ اور سلف صالحین کے مسلک کو نظر انداز کر کے عبداللہ بن جعفرؓ کے مسلک کو ''اُسوۂ حسنہ'' قرار دے دیا جائے' بشرطیکہ ان کی طرف غناء کی نسبت صحیح طور پر ثابت بھی ہو۔

سلف صالحین کا مسلک

ابوبکر طرطوشی لکھتے ہیں کہ ابراہیم بن سعد اور عبید بن حسن العنبری قاضیٔ بصرہ یہ دونوں غناء کے قائل تھے' لیکن ان کا یہ مسلک جماعت مسلمین کے یکسر خلاف تھا' اُمت میں کوئی بھی اس بارے میں ان کا ہم نوا نہیں ملتا۔ (اغاثة اللّهفان' ص ۱۲۲)

علامہ آلوسیؒ کہتے ہیں کہ عز بن عبدالسلام اور ابن دقیق العیدؒ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ سماع کے قائل تھے' بے بنیاد اور سرتاسر جھوٹ ہے۔ (تفسیر روح المعانی' ج ۲۱' ص ٦٨)

ائمہ اربعہ کا مسلک

علامہ آلوسیؒ امام طرطوشی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ غناء کی حرمت کے قائل تھے' اہلِ کوفہ اور اہلِ بصرہ کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے' سفیان' حماد' شعبی' ابراہیم نخعی سب کا یہی مسلک تھا۔ امام مالک بھی اس کی حرمت کے قائل تھے۔ ان کا ایک فتویٰ ہے کہ اگر کوئی شخص لونڈی خریدے اور بعد میں وہ مغنیہ ظاہر ہو تو مشتری اسے عیب دار قرار دے کر واپس کر سکتا ہے۔ امام مالک سے اہلِ مدینہ کے طرزِ عمل کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: اِنَّمَا یَفْعَلُهٗ عِنْدَنَا الْفُسَّاقُ یعنی ہمارے ہاں یہ کام فاسق و فاجر لوگ ہی کرتے ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ بھی اس کی حرمت کے قائل تھے۔ امام محترم کے صاحبزادے عبداللہ نے غناء کے بارے میں اپنے والد سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ غناء دل میں نفاق کا بیج بوتا ہے۔ امام شافعیؒ اسے مکروہ مشابہ باطل قرار دیتے ہیں۔ ان کا فتویٰ ہے کہ جو اس مشغلے میں زیادہ دلچسپی لے وہ احمق ہے' اس کی شہادت ردّ کر دی جائے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر روح المعانی' ج ۲۱' ص ۱۶۔

اس پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآنی اشارات' سنت کی تصریحات' آثارِ صحابہؓ' اقوالِ تابعینؒ اور سلف صالحینؒ کا تعامل اس بات پر گواہ ہے کہ غناء اور اس کے آلات سے وابستگی اسلامی مزاج کے یکسر خلاف ہے۔ سوائے دو چار افراد کے ملت کا فیصلہ یہی ہے...... ﴿فَبَشِّرْ عِبَادِ ٥ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ......﴾

فرض آپ کو پکار رہا ہے!

مولانا محمد یوسف اصلاحی

بے شک آپ پابندی سے نماز پڑھتے ہیں' روزے رکھتے ہیں' زکوٰۃ کا بھی اہتمام کرتے ہیں' استطاعت ہو تو حج کو بھی جاتے ہیں' آپ اسلامی وضع قطع کے بھی پابند ہیں' حلال وحرام کی تمیز میں بھی نہایت حساس ہیں' آپ تقویٰ وطہارت کے لوازم کا بھی التزام کرتے ہیں اور نوافل واذکار' صدقہ وخیرات کا بھی زیادہ سے زیادہ خیال رکھتے ہیں' اس لئے کہ آپ کو اپنے مسلمان ہونے کا احساس ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اس احساس میں آپ تنہا بھی نہیں ہیں' آپ کی طرح شریعت کے احکام و آداب کی اتباع اور پیروی کرنے والے اُمت میں ہزاروں نہیں لاکھوں ہیں۔ اور اگر میں یہ دعویٰ کروں تو اس کی تردید نہیں کی جاسکتی کہ اپنی عبرت ناک پستی کے باوجود آج بھی مسلمان اپنے مذہب کی پیروی اور عبادات سے شغف میں ہر مذہب کے پیروؤں سے آگے ہیں۔ اُمت مسلمہ میں ایسے لاکھوں افراد اب بھی موجود ہیں جن کی زندگیاں قابلِ رشک حد تک خدا ترسی اور فرض شناسی کا نمونہ ہیں' جن کی سیرت اور کردار آئینے کی طرح صاف ہے' جن کا تقویٰ ہر شبہ سے بالا ہے' اور جن پر سوسائٹی اعتماد کرتی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی مذہبی گروہ ان کی ٹکر کے انسان پیش کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلمان تعداد کے اعتبار سے بھی دنیا میں دوسری عظیم اکثریت ہیں۔ ان کے پاس ہر طرح کے وسائل و ذرائع بھی ہیں۔ ان کے پاس کوئلہ بھی ہے' پٹرول بھی ہے' لوہا بھی ہے' سونا بھی ہے' یہ دولت مند بھی ہیں اور دنیا کے کتنے ہی حصوں

میں ان کی اپنی حکومتیں بھی ہیں۔
مگر تلخ سہی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس مذہبی تقدس اور دولت وحکومت کے باوجود سب سے زیادہ ذلیل وخوار اور بے وزن یہی مسلمان قوم ہے۔ نہ ان کی اپنی کوئی رائے ہے' نہ کوئی منصوبہ' نہ ان کا کوئی وقار ہے اور نہ کوئی اعتبار۔ انفرادی حیثیت سے ان میں یقیناً لاکھوں ایسے ہیں جن پر انسانیت فخر کرسکتی ہے' لیکن اجتماعی حیثیت سے دنیا میں ان کا کوئی مقام نہیں ہے۔

آپ اسی اُمت کے ایک فرد ہیں۔ آپ کا مستقبل اُمت کے مستقبل سے وابستہ ہے۔ کیا آپ کو یہ احساس پریشان کرتا ہے کہ اُمت کو اِس ذلت سے نکالا جائے اور اس کو عظمت رفتہ حاصل کرنے کے لئے پھر سے بے تاب کردیا جائے؟

کبھی آپ نے غور کیا کہ اس بے قدری اور ذلت کی وجہ کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ اُمت نے اپنا وہ فرض بھلا دیا ہے جس کے لئے خدا نے اس کو پیدا کیا تھا۔ اُمت مسلمہ عام اُمتوں کی طرح کوئی خود رو اُمت نہیں ہے۔ اس کو خدا نے ایک خاص منصوبے کے تحت ایک عظیم مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ خدا نے اس کی زندگی کا وہی مشن قرار دیا ہے جو اپنے اپنے دور میں خدا کے پیغمبروں کا مشن رہا ہے۔ نبوت کا سلسلہ نبی اُمی ﷺ پر ختم ہوگیا۔ آپؐ کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔ خدا کے بندوں تک خدا کا دین پہنچانے کا کام اب رہتی زندگی تک اسی اُمت کو انجام دینا ہے۔ یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے' اسی کی خاطر اللہ نے اسے ایک اُمت بن کر رہنے کی تاکید کی ہے' اور اسی فرض کی ادائیگی سے اس کی تقدیر وابستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾

''تم کو ایک ایسی اُمت بن کر رہنا چاہئے جو خیر کی طرف لوگوں کو دعوت دے''۔

خیر سے مراد ہر وہ نیکی اور بھلائی ہے جس کو نوعِ انسانی نے ہمیشہ نیکی اور بھلائی سمجھا ہے اور خدا کی وحی نے بھی اس کو نیکی اور بھلائی قرار دیا ہے۔ الخیر سے مراد وہ ساری نیکیاں ہیں جن کے مجموعے کا نام دین ہے' اور جو ہمیشہ خدا کے پیغمبر خدا کے بندوں

تک پہنچاتے رہے ہیں۔ اُمت کا کام یہ ہے کہ وہ خدا کے بندوں کو کسی اُمت یاز کے بغیر اس دین کی دعوت دے' اور اسی سوز اور تڑپ کے ساتھ دعوت کا کام کرے جس طرح خدا کے پیغمبروں نے کیا ہے' اس لئے کہ وہی مشن خدا نے اِس اُمت کے سپرد کیا ہے۔

اُمت کی زندگی میں دعوتِ دین کے کام کی وہی حیثیت ہے جو انسانی جسم میں دل کی حیثیت ہے۔ انسانی جسم اسی وقت تک کارآمد ہے جب تک اس کے اندر دھڑکنے والا دِل موجود ہو۔ اگر یہ دل دھڑکنا بند کر دے تو پھر انسانی جسم' انسانی جسم نہیں ہے مٹی کا ڈھیر ہے' اس لئے کہ جسم کو صالح خون پہنچانے والا اور اس کو زندہ رکھنے والا دل ہے۔

ٹھیک یہی حیثیت دعوت دین کی بھی ہے۔ اگر اُمت یہ کام سرگرمی سے انجام دے رہی ہے' خدا کے منصوبے اور منشا کے مطابق اُمت میں صالح عناصر کا اضافہ ہو رہا ہے' اور غیر صالح عنصر چھٹ رہا ہے' نیکیاں پنپ رہی ہیں اور بُرائیاں دم توڑ رہی ہیں تو اُمت زندہ ہے اور عظمت وعزت اور وقار و سربلندی اس کی تقدیر ہے' لیکن اُمت اگر اس فرض سے غافل ہو جائے' دینِ حق کے کام کا اسے احساس ہی نہ رہے تو وہ زندگی سے محروم ہے۔ اور مُردہ ملت بھلا عزت وعظمت کا مقام کیسے پا سکتی ہے!

خدا کے نزدیک بھی اُمت کی تمام تر اہمیت اسی وقت ہے جب وہ اس منصب کے تقاضے پورے کرے جس پر خدا نے اسے سرفراز فرمایا ہے۔ اگر وہ اس منصب ہی کو فراموش کر دے اور اسے احساس ہی نہ رہے کہ خدا نے مجھے کس کام کے لئے پیدا کیا ہے تو پھر خدا کو اُس کی کیا پروا کہ کون اسے پیروں میں روندرہا ہے اور کون اس کی عزت سے کھیل رہا ہے۔

◄ آپ کے ہاتھ میں بندھی ہوئی یہ قیمتی گھڑی یقیناً آپ کی نظر میں ایک نعمت ہے' آپ نے اِس کو اِس لئے اپنے ہاتھ پر جگہ دی ہے کہ یہ آپ کو صحیح وقت بتائے اور آپ اپنے اوقات کو منظّم کر کے ٹھیک وقت پر اپنے سارے کام انجام دے سکیں۔ اگر یہ گھڑی اپنا کام ٹھیک ٹھیک انجام دے تو آپ اسے اپنے ہاتھ کی زینت بنائے رکھتے ہیں' اہتمام کے ساتھ اس کی حفاظت کرتے ہیں' آپ کو گوارا نہیں ہوتا کہ اس پر پانی کی ایک

بوند پڑے‘اس کے نازک شیشے کو ذرا سی ٹھیس لگے یا کسی چیز سے یہ ٹکرائے۔لیکن گھڑی کی یہ ساری قدرومنزلت اور اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کا یہ اہتمام اسی وقت تک ہے جب تک وہ صحیح وقت بتاتی ہے۔اگر وہ بار بار بند ہونے لگے‘ کبھی آدھا گھنٹہ تیز ہو جائے اور کبھی ایک گھنٹہ سُست چلنے لگے‘ آپ بار بار اس سے دھوکہ کھائیں‘ آپ کے پروگرام اس سے متاثر ہونے لگیں اور وہ مقصد اس سے پورا نہ ہو جس کی خاطر آپ نے اسے اپنے ہاتھ پر جگہ دی تھی تو کیا آپ یہ برداشت کریں گے کہ پھر بھی وہ آپ کے ہاتھ کی زینت بنی رہے‘ اور آپ اسی طرح اس کی حفاظت کرتے رہیں؟ یقیناً آپ کا فیصلہ یہ ہوگا کہ یہ گھڑی نہیں چند پُرزوں کا مجموعہ ہے اور پیتل کے چند ٹکڑے ہیں‘ اس کی مناسب جگہ انسان کا قابلِ احترام ہاتھ نہیں بلکہ کباڑیئے کی دکان ہے‘ اور پھر آپ کو اس کی کیا پروا کہ کباڑی اس کو کہاں ڈالتا ہے اور اس کو کس بے دردی کے ساتھ کوٹتا اور توڑتا ہے یا کوئی اس کو بھٹی میں گلاتا ہے۔آپ کے نزدیک تو بجا طور پر اس کی جو کچھ قدرومنزلت تھی اسی بنا پر تھی کہ وہ صحیح وقت بتائے‘ اس لئے کہ بنانے والے نے اسے اسی لئے بنایا تھا‘ اور آپ نے ایک بڑی رقم دے کر اسی لئے خریدا تھا۔

خدا نے اُمت مسلمہ کو اسی لئے پیدا کیا تھا کہ وہ دوسروں تک خدا کا دین پہنچائے‘ سوسائٹی میں نیکیوں کا پرچار کرے اور برائیوں کو مٹائے۔ جب تک وہ اپنے اس فرض کو انجام دیتی رہے گی‘ خدا کی نصرت وحمایت بھی اسے حاصل رہے گی‘ وہ اس کا محافظ اور نگہبان بھی ہوگا اور اسے عظمت ووقار کی بلندیوں سے سرفراز بھی فرمائے گا۔لیکن اُمت اگر اس فرض سے غافل ہو جائے تو پھر نہ اس کی کثرتِ تعداد اسے کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے‘ نہ دولت وحکومت اس کے کام آسکتی ہے‘ نہ تسبیح وتہلیل اور نوافل واذکار کی کثرت سے وہ عظمتِ رفتہ کو پا سکتی ہے اور نہ یہ انفرادی دینداری اس کو خدا کے غضب سے بچا سکتی ہے۔اگر ہر طرف بگاڑ ہو اور خدا کے بندے خدا کو بھول کر اپنی من مانی کر رہے ہوں اور آپ ان سے بے فکر صرف اپنی فکر میں لگے ہوئے ہوں تو سمجھ لیجئے کہ خدا کا عذاب بہت قریب ہے اور پھر اس کی پکڑ سے کوئی بچ نہ سکے گا...... حضرت جابر رضی اللہ

عنہ کا بیان ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اَوْحَی اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰی جِبْرَئِیْلَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِیْنَۃَ کَذَا وَکَذَا بِاَھْلِھَا' فَقَالَ یَا رَبِّ اِنَّ فِیْھِمْ عَبْدَکَ فُلَانًا لَمْ یَعْصِکَ طَرْفَۃَ عَیْنٍ)) قَالَ : ((فَقَالَ اقْلِبْھَا عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمْ' فَاِنَّ وَجْھَہٗ لَمْ یَتَمَعَّرْ فِیَّ سَاعَۃً قَطُّ)) (مشکوٰۃ' باب الامر بالمعروف عن جابر)

''خدائے بلند و برتر نے جبرئیلؑ کو حکم دیا کہ ایسی ایسی بستی کو اُلٹ دو۔ جبرئیلؑ نے کہا: پروردگار! ان میں تو تیرا ایک ایسا نیک بندہ ہے جس نے پلک جھپکانے کی حد تک بھی کبھی تیری نافرمانی نہیں کی ہے۔ پروردگار نے کہا: ہاں جبریل! بستی کو اس پر بھی الٹ دو اور دوسروں پر بھی' اس لئے کہ (ان بستیوں میں علی الاعلان میری نافرمانی ہوتی رہی اور) اس کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی۔''

یہ حدیث اگر آپ کے اندر کوئی بے تابی پیدا کرے تو اس کی قدر کیجئے اور خدا سے دعا کیجئے کہ وہ اس بے تابی میں اور اضافہ کرے۔ آپ کا فرض آپ کو پکار رہا ہے' اور یہی بے تابی آپ کو اپنا فرض ادا کرنے پر آمادہ کرسکتی ہے۔

سکوں مجھ کو نہیں درکار آقا
بڑھا دیجے میری بے تابیٔ دل!

بقیہ: اقامت دین کے لئے کام کرنے والوں کے مطلوبہ اوصاف

اصل میں رفیق کا بنیادی مفہوم یہی ہے۔ رفق کہتے ہیں دل کی نرمی کو۔ حدیث شریف میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: ((مَنْ یُحْرَمِ الرِّفْقَ فَقَدْ حُرِمَ الْخَیْرَ کُلَّہٗ)) ''جو شخص دل کی نرمی سے محروم ہوگیا وہ کل کے کل خیر سے محروم ہوگیا''۔ رفیق اصل میں وہی کہلائیں گے جو باہم ایک دوسرے کے لئے نرم ہوں' جن کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے نرم گوشے ہوں' جو ایک دوسرے کی تکلیف پر تڑپ اٹھیں' ایک دوسرے کے درد کو اپنے اندر محسوس کریں۔ تو یہ پہلا وصف ہے اس جماعت کے ''رفقاء'' کا جو اقامت دین کی کٹھن وادیوں میں قدم رکھنے کی تیاری کر رہی ہو' جو اس آیۂ مبارکہ کے حوالے سے ہمارے سامنے آیا ہے۔ (جاری ہے)

بدعات کیوں قابلِ مذمت ہیں؟

تحریر: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اسلام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے۔ یہی اُس نے انسانوں کے لئے منتخب کیا ہے۔ جو کوئی بھی اسلام کے علاوہ کوئی اور طریقۂ زندگی اختیار کرے گا وہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ﴾ (آل عمران: ۸۵)

''اور جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا تو وہ اُس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔''

وجہ اس کی یہ ہے کہ دینِ اسلام کے قواعد و ضوابط اور اوامر و نواہی خود انسان کے خالق نے بنائے ہیں اور خالق اپنے علم' قدرت' اختیار اور حکمت میں بے مثل و بے مثال ہے۔ اس کی تخلیق میں کسی طرح کا عیب یا نقص نہیں ہو سکتا' کیونکہ وہ خود ہر کمزوری اور عیب سے پاک ہے۔ اُس نے جو ضابطۂ حیات انسان کے لئے پسند کیا ہے وہ ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ اس بات کا اعلان خود اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے آخری ایام میں ان الفاظ کے ساتھ کر دیا تھا:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ﴾ (المائدۃ: ۳)

''آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین (ضابطۂ حیات) مکمل کر دیا' اور تمہارے اوپر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا۔''

یوں اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام کی تکمیل رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں کر دی۔ اب قرآن اسلامی تعلیمات کا سرچشمہ ہے اور رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اُس کا عملی نمونہ۔ چنانچہ قرآنِ پاک میں جگہ جگہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا

ہے اور آپؐ کی زندگی کو بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ......﴾ (الاحزاب:۲۱)

''بے شک تمہارے لئے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔''

پھر فرمایا:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَكُمْ﴾ (محمد:۳۳)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور (اس کے خلاف کر کے) اپنے اعمال ضائع نہ کرو۔''

اب مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے شب و روز کے مشاغل میں سیرتِ طیبہ سے راہنمائی حاصل کرے۔ کیونکہ سیرتِ طیبہ ہی وہ طرزِ زندگی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ آپؐ کے طرزِ عمل کے خلاف کام کرنے سے سختی کے ساتھ منع کر دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۚ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا﴾ (النساء:۱۱۵)

''اور جو کوئی خلاف کرے رسول کے' بعد اس کے کہ اس پر ہدایت واضح ہو چکی' اور پیروی کرے مسلمانوں کی راہ کے علاوہ کسی دوسری راہ کی تو ہم پھیر دیں گے اس کو جدھر کو وہ پھرا اور ہم اس کو جہنم میں داخل کریں گے' اور وہ بُری جگہ ہے پھر جانے کی۔''

اسی پر بس نہیں بلکہ اللہ اور رسول کی خلاف ورزی پر قیامت کے دن کی رسوائی اور ندامت کا نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے کر دیا کہ اُس وقت اپنے خلافِ سنّت عمل پر پچھتاوا کسی کام نہ آئے گا۔ آج موقع ہے کہ وہی کام کئے جائیں جو رسول اللہ ﷺ نے زندگی بھر کئے اور جن کے کرنے کا حکم دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِى النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا﴾ (الاحزاب:٦٦)

''جس دن پھیرے جائیں گے اُن کے چہرے آگ کے اندر' کہیں گے اے.
کاش! ہم نے فرمانبرداری کی ہوتی اللہ کی اور اطاعت کی ہوتی رسول کی۔''

پس دانش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ ہر مسلمان رسول اللہ ﷺ کی سادہ اور صاف زندگی کو نمونہ بناتے ہوئے وہی کام کرے جو آپؐ نے کئے ہیں یا اُن کا حکم دیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ آپؐ نے خلفائے راشدین کے عمل کو بھی سند کا درجہ دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر کوئی چیز کتاب وسنّت میں واضح نہ ہو تو صحابۂ کرام کے مجمع علیہ عمل کی پیروی کرو۔ آپؐ نے فرمایا:

((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ)) (ابو داود' ترمذی)

''پس تمہارے اوپر لازم ہے کہ میرا طریقہ اختیار کرو اور میرے ہدایت یافتہ اور راست رو خلفاء کا طریقہ اختیار کرو۔''

یوں آپؐ نے اُمت کے لئے مزید آسانی پیدا کر دی کہ اگر کسی معاملے میں سنّت سے راہنمائی نہ مل رہی ہو تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل دیکھ لیا جائے کیونکہ صحابہ وہ لوگ تھے جنہوں نے خود حضور ﷺ سے دین سیکھا۔ وہ قرآن کو خوب سمجھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کا اُسوۂ حسنہ ان کے سامنے تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی ہمہ وقت صحبت نے انہیں مزاجِ رسول کا شناسا بنا دیا تھا' لہٰذا ان کا طریقہ بھی سنّت کی طرح مستند اور محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ آپؐ نے کسی کے عمل کو سند کا درجہ عطا نہیں کیا۔ تو اب ضروری ہوا کہ کتاب وسنّت اور تعامل صحابہ تک محدود رہا جائے' کیونکہ اس کے علاوہ کسی عمل کو سند حاصل نہیں ہے کہ اسے اختیار کیا جائے۔

بدعت اُس کام کو کہتے ہیں جو بظاہر اچھا اور خوشنما ہو مگر نہ تو قرآن وسنّت میں موجود ہو اور نہ ہی صحابہ کرامؓ کے عمل و کردار کا حصّہ رہا ہو۔ ایسا کام خوشنما نظر آنے کے باوجود شریعت اسلامیہ میں ناپسندیدہ بلکہ گمراہی ہے۔ ایک صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((..... مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرٰى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ' فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ ' عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ ' وَاِيَّاكُمْ

وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ، فَاِنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) (ابو داؤد، ترمذی)

''جو کوئی تم میں سے میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا۔ پس تم پر میرے اور میرے ہدایت یافتہ اور راست رو خلفاء کے طریقے کی پیروی لازم ہے، اسے اپنے مضبوط دانتوں سے پکڑے رہنا اور نئے نئے کاموں سے بچتے رہنا، کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔''

بدعت اس لئے مردود و مسترد ہے کہ یہ دین میں مداخلت ہے۔ دین تو مکمل ہو چکا، زندگی کے شب و روز گزارنے کا مستند اور محفوظ طریقہ ہمارے پاس موجود ہے، اب اس میں کسی طرح کے اضافے کی گنجائش نہیں۔ جس طرح دین میں کسی طرح کی کمی کرنا جائز نہیں اسی طرح اضافہ بھی جائز نہیں، کیونکہ متناسب اور مکمل چیز ہوتی ہی وہ ہے جس میں کمی بھی اُس کے کمال میں نقص پیدا کرے اور اضافہ بھی بگاڑ پیدا کرے۔ عام طور پر کمی کا نقص پیدا کرنا تو سمجھ میں آ جاتا ہے مگر اضافہ ناگوار معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہم انسان کی بنائی ہوئی کسی بھی مکمل اور خوبصورت چیز میں اضافے کی گنجائش موجود پاتے ہیں، اسی طرح دین کو بھی مزید مزین کرنے کی کوشش کو ناپسندیدہ نہیں سمجھتے، حالانکہ ہم یہ بات بھول جاتے ہیں کہ دین تو اللہ کا بنایا ہوا اور مکمل کیا ہوا ہے، اس میں اب ذرہ برابر اضافہ بھی اُسی طرح اس کے حسن کو متاثر کرے گا جس طرح اس میں سے کسی شے کو کم کر دینا۔ دین اسلام کی تکمیل کو انسان کی مکمل کردہ شے کی طرح سمجھنا سخت نادانی ہے۔ ایک شخص اپنا مکان تعمیر کرتا ہے، اس پر کثیر رقم خرچ کر کے ضرورت کی ہر شے مہیا کرتا ہے، عمارت کے ظاہری حسن کو قیمتی پتھروں اور رنگ برنگے شیشوں کے ساتھ مزین کرتا ہے، بجلی کے قمقموں کے ساتھ روشنی کا وافر بندوبست کرتا ہے، گویا اس کو ہر لحاظ سے مکمل کر لیتا ہے۔ یہ کام ایک انسان نے انتہائی جدوجہد کر کے اور ضروری وسائل استعمال کر کے مکمل کیا ہے، مگر عین ممکن ہے کہ اس کا کوئی دوست اس کے ہاں آئے اور صاحب خانہ کو کوئی خامی بتائے اور مزید بہتر کرنے کی تجویز دے جسے صاحب خانہ بھی تسلیم کر لے۔ مگر دین جو خدا کا بنایا ہوا اور مکمل کیا ہوا ہے اس میں اس طرح کی قطعاً

گنجائش نہیں ہے کہ کوئی شخص اس میں اضافہ تجویز کرے اور وہ قبول بھی کرلیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم بنایا۔ خوبصورت شکل وصورت اور متناسب اعضاء و جوارح عطا کئے۔ اگر اس کے کسی عضو میں خامی واقع ہو جائے تو اس کے جسم میں نقص پیدا ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر انسان کے چہرے پر دو آنکھیں سجائی گئی ہیں، اگر خدانخواستہ ایک آنکھ ضائع ہو جائے یا بالکل بند ہو جائے تو انسان کا وہی خوبصورت چہرہ بھیانک صورت اختیار کر لے گا۔ اسی طرح انسان کی متناسب اور موزوں ترکیب میں اضافہ بھی نقص اور برائی پیدا کرے گا۔ غور کیجئے اگر کسی آدمی کے چہرے پر دو کی بجائے تین آنکھیں ہوں تو کیا اس ایک آنکھ کا اضافہ اس کے حسن میں اضافے کا باعث ہوگا؟ ہرگز نہیں، بلکہ وہ تو اسے بدصورت بنا دے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جو چیز کمال کی انتہا پر ہو اُس میں کسی اضافے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ صاف ظاہر ہے کہ جس چیز میں ابھی مزید بہتری کی گنجائش ہو اُسے اکمل اور مکمل تو نہیں کہا جاسکتا۔ پہلے ذکر ہو چکا کہ انسان کی بنائی ہوئی کوئی شے اکمل اور مکمل ایک حد تک تو ہوسکتی ہے، مگر ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس میں مزید خوبی پیدا کرنے کی گنجائش نہ ہو، کیونکہ انسان بہر حال انتہا درجے کی ذہانت اور صلاحیت کے باوجود کمزوریاں رکھتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ نہیں، وہ ہر طرح کے عیب اور کمزوری سے پاک ہے۔ اس لئے اس کا ہر کام کمالِ حکمت کا مظہر ہے۔ اس نے جس چیز کو تکمیل کے آخری مرحلے پر پہنچا دیا اب اس میں کمی کرنا اور زیادتی کرنا دونوں ایک جیسے جرم ہیں۔

دین اسلام کو اللہ تعالیٰ نے مکمل کر دیا۔ اب جو چیزیں اس میں داخل کر دی گئی ہیں بس وہی اس کے اجزاء ہیں۔ اگر اس کے اجزاء میں اضافہ کیا جائے گا تو وہ دین کے چہرے کو مزید خوشنما نہیں بنائے گا بلکہ بدنما کر دے گا۔ اسی لئے جو شخص رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو انسانیت کے لئے اُسوۂ حسنہ سمجھتا ہے اس کے دل میں تو کبھی یہ خیال نہیں گزر سکتا کہ رسول اللہ ﷺ کی مسنون چیزوں کے علاوہ بھی کوئی چیز دین کا جزو بن کر محلِ ثواب ہوسکتی ہے۔ آپؐ کی زندگی میں بچوں کی پیدائش اور خوشی کے دیگر مواقع

بھی آئے، چھوٹوں اور بڑوں کی وفات کا غم بھی آپ ؐ کو پیش آیا۔ ایسے مواقع پر رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل ہی پسندیدہ، جامع اور مکمل ہے، اس پر کسی طرح کا اضافہ نہ صرف یہ کہ قابلِ تحسین نہیں بلکہ مذمت کے لائق ہے۔

دین مکمل ہو چکا۔ اب ہمارا فرض ہے کہ اس کے اوامر پر عمل کریں اور نواہی سے رکیں، اپنی طرف سے دین کے کسی کام میں ہرگز نہ کوئی کمی کریں اور نہ اضافہ، یہ دونوں ہی مذموم ہیں۔ کمی کا بُرا ہونا تو ظاہر ہے مگر زیادتی بھی اتنی ہی بُری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ)) (صحیحین)

''جس شخص نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات پیدا کی جو دین میں نہیں تو وہ نامقبول ہے۔''

علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ بدعت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں: ''ایسا کام کرنا جس کی اصل کتاب وسنّت اور قرونِ مشہود لہا بالخیر میں نہ ہو اور اس کو دین اور ثواب کا کام سمجھ کر کیا جائے''۔ پس دین کے اندر کچھ تہواروں اور رسوم کا اپنی طرف سے اضافہ ہی بدعت ہے۔ اس کی ایک واضح پہچان یہ ہے کہ ان تہواروں کے منانے یا رسوم کی ادائیگی کا پروگرام شریعت سے نہیں ملے گا، بلکہ خود انسانوں کو اپنی خواہش کے مطابق ترتیب دینا ہوگا۔ غور کیجئے عید الفطر اور عید الاضحیٰ اسلامی تہوار ہیں۔ ان تہواروں کو منانے کا طریقہ اور پروگرام آپ کو قرآن وسنّت اور عمل صحابہ ؓ سے مل جائے گا۔ اس کے علاوہ اگر کسی دن کو عید کا نام دیا جائے تو اس دن کا پروگرام کہاں سے لیا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ انسان اپنی پسند کے مطابق وہ پروگرام وضع کرے گا۔ تو کسی انسان کا وضع کردہ پروگرام دین کا حصّہ کیسے بن سکتا ہے! پھر اسلام کی تعلیمات میں اور بہت کچھ ڈالا جا سکتا ہے، مگر دانستہ طور پر خالق نے اوامر کو مختصر اور سادہ رکھا تاکہ اس پر عمل کرنا عوام الناس کے لئے آسان ہو۔ یہ تو بنی اسرائیل کا طریقہ تھا کہ انہوں نے بہت سے رسوم و رواج دین کے نام پر شروع کر دیئے تھے اور اس طرح دین کو مشکل بنا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ

نے رسول اللہ ﷺ کو بھیج کر اُن اِصر و اغلال (۱) کے بوجھ سے انسان کو آزاد کیا اور دین میں آسانی پیدا کی' اور یہی اللہ کی مرضی بھی ہے۔ دیکھئے ارشادِ ربانی ہے:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرة:١٨٥)

''اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے لئے تنگی نہیں چاہتا۔''

پس دین کے اندر اضافے کر کے دین کی سادگی کو قائم نہ رہنے دینا اور مشکلات پیدا کرنا ہرگز محمود عمل نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ انسانوں کو قرآن کے الفاظ میں حکم دیتا ہے یا رسول اللہ ﷺ کی زبان سے احکام صادر فرماتا ہے۔ ایسے احکام کی تعمیل لوگوں پر لازم ہوتی ہے۔ یا پھر صحابہ کا عمل لوگوں کے لئے اختیار کرنا جائز ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ آج کون ہے جو اپنی طرف سے اُمتِ محمدؐ کو کسی کام کے بجالانے کا حکم خود اپنی خواہش کے مطابق دے سکے اور اُمت اُس کے اختیار کرنے کی بھی اُسی طرح پابند ہو جیسے کتاب وسنت کے احکام کی؟ یہ طرزِ عمل تو خود کو رسولؐ کے مقام پر لا کھڑا کرنے کے مترادف ہے جو نری ہلاکت ہے۔ پس بدعات سے بچنا نہایت ضروری ہے۔ ہمارے لئے وہی اعمال بہت کافی ہیں جو شریعت میں ہمارے لئے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ اگر ہم ان کو ہی صحیح انداز میں اپنا سکیں تو فہو المطلوب۔ بدعت انتہائی نامعقول عمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ))

''ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی آگ میں ڈالے جانے کے لائق ہے۔''

یہی تو انسان کا امتحان ہے کہ وہ اپنی پسند و ناپسند کو احکامِ شریعت کے تابع رکھے۔ شریعت کی روشنی کو چھوڑ کر اپنی خواہش کے مطابق جو بھی عمل کیا جائے خواہ وہ کتنا ہی بھلا معلوم ہو اور نیت کتنی ہی اچھی ہو' نفسانی خواہش کی پیروی کی وجہ سے مردود و مسترد ہے۔ یہاں اس سوال میں کوئی معقولیت نہیں کہ ریل اور ہوائی جہاز پر سواری کیوں کی جاتی ہے جبکہ ان پر سواری نہ تو رسول اللہ ﷺ نے کی نہ صحابہ کرامؓ نے' کیونکہ ریل اور

---

(۱) دیکھئے الاعراف:۱۵۷

ہوائی جہاز دنیاوی سامان ہے دین نہیں۔ مادی ایجادات سے شریعت کے اصولوں کے مطابق فقہاء کرام کی راہنمائی میں استفادہ کرنا بالکل جائز ہے' مگر بزعم خویش اچھی سے اچھی رسم ایجاد کرنا اور دوسروں کو اس عمل کی تلقین کرنا اور اس عمل کو کارِ ثواب سمجھنا بدعت ہے۔ آج مسلمان مساجد میں نئی نئی رسموں کی ادائیگی کے لئے مجالس منعقد کرتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ ان میں شامل ہو کر ثوابِ دارین حاصل کریں۔ ایسی خود ساختہ مجالس کا انعقاد ہی جائز نہیں تو ان پر ثواب کیسا؟ مگر ع دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے! انسان کو فریب نفس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے' ورنہ شیطان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ سبز باغ دکھا کر انسان کو غلط کام پر آمادہ کر لیتا ہے۔ جب آدمی فی سبیل اللہ خرچ کرنے لگتا ہے جو سراسر فائدے کی بات ہے تو شیطان نمود و نمائش پر اکساتا ہے تاکہ یہ عمل اکارت چلا جائے' یا پھر سرے سے خرچ کرنے ہی سے یہ کہہ کر روک دیتا ہے کہ خرچ کرو گے تو مفلس ہو جاؤ گے' یا پھر ایسی جگہ خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے جہاں خرچ مشروع نہ ہو۔ چنانچہ صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ جو کام بھی کیا جائے اُس کی شرعی حیثیت معلوم کرنے کے لئے قرآن و سنّت اور عمل صحابہ کی طرف رجوع کیا جائے' تاکہ فریب نفس اور اغوائے شیطان سے محفوظ رہا جا سکے۔

پاکستان کیسے ٹوٹا' کس نے توڑا؟ پاکستان توڑنے کا ذمہ دار کون؟

7 دسمبر 1970ء سے 16 دسمبر 1971ء تک سانحہ مشرقی پاکستان کی تاریخ وار روداد

حمود الرحمٰن کمیشن کے سامنے سابق گورنر ایڈمرل ایس ایم احسن کا بیان ..... نیز

مجیب الرحمٰن کے قتل کی کہانی' حسینہ واجد کی زبانی

جیسے چونکا دینے والے موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے ایک مبسوط دستاویز

ندائے خلافت کی خصوصی اشاعت

بابت 23 دسمبر 1996ء بحوالہ

سقوطِ مشرقی پاکستان

23X33 سائز کے 68 صفحات کی قیمت صرف اور صرف 20 روپے

(مذکورہ بالا خصوصی اشاعت ایک محدود تعداد میں سٹاک میں موجود ہے!)

ملنے کا پتہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501

مسلمان کا طرزِ حیات (۲۶)

علامہ ابو بکر الجزائری کی شہرۂ آفاق تالیف

"منھاجُ المُسلم" کا اردو ترجمہ

مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

کتاب الاداب

چھٹا باب

مخلوق سے تعلق کے آداب

۷۔ عام مسلمانوں کے آداب و حقوق

(۱۴) اسے ناحق گالی نہ دے' نہ اس کی زندگی میں' نہ اس کی وفات کے بعد' کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

((سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ ' وَقِتَالُهٗ كُفْرٌ)) (۱۰۱)

"مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے"۔

اور فرمایا :

((لَا يَرْمِيْ رَجُلٌ رَجُلاً بِالْفِسْقِ اَوِ الْكُفْرِ اِلَّا ارْتَدَّ عَلَيْهِ اِنْ لَمْ يَكُنْ صَاحِبُهٗ كَذٰلِكَ)) (۱۰۲)

"جب کوئی آدمی دوسرے کو فاسق یا کافر کہتا ہے تو اگر وہ ایسا نہیں ہے تو یہ بات اُس (کہنے والے) پر لوٹ آتی ہے"۔

نیز فرمایا :

((اَلْمُتَسَابَّانِ مَا قَالَا ' فَعَلَى الْبَادِئْ مِنْهُمَا حَتّٰى يَعْتَدِيَ الْمَظْلُوْمُ)) (۱۰۳)

"ایک دوسرے کو گالی دینے والے دونوں آدمی جو کچھ کہتے ہیں اس کا گناہ پہل کرنے والے پر ہوتا ہے حتیٰ کہ مظلوم حد سے بڑھ جائے (یعنی زیادہ گالیاں

دے)"۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے:

((لَا تَسُبُّوا الْاَمْوَاتَ فَاِنَّهُمْ قَدْ اَفْضَوْا اِلٰى مَا قَدَّمُوْا)) (۱۰۴)

"فوت شدہ افراد کو گالی نہ دو۔ انہوں نے جو (اعمال) آگے بھیجے تھے' ان تک پہنچ گئے ہیں"۔

ایک بار آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((مِنَ الْكَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَيْهِ)) قَالُوْا: وَهَلْ يَشْتِمُ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ؟ قَالَ: ((نَعَمْ 'يَسُبُّ اَبَا الرَّجُلِ فَيَسُبُّ اَبَاهُ وَيَسُبُّ اُمَّهُ فَيَسُبُّ اُمَّهُ)) (۱۰۵)

"کسی شخص کا اپنے والدین کو گالی بکنا کبیرہ گناہ ہے"۔ صحابہ نے عرض کیا: کیا کوئی شخص اپنے والدین کو بھی گالی دے سکتا ہے؟ فرمایا: "ہاں' وہ دوسرے شخص کے باپ کو گالی دیتا ہے تو وہ اُس کے باپ کو گالی دے دیتا ہے اور وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اُس کی ماں کو گالی دے دیتا ہے"۔

(۱۴) مسلمان سے حسد' بد ظنی اور بغض نہ رکھے' نہ اس کے اعمال اور حالات کے متعلق جاسوسی کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ ﴾ (الحُجرات: ۱۲)

"اے مؤمنو! اکثر گمان سے بچو' یقیناً بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور تجسس نہ کیا کرو اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کیا کرو"۔

نیز ارشاد ہوتا ہے:

﴿ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا... ﴾ (النُّور: ۱۲)

"جب تم نے یہ بات سنی تھی تو مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں نے اپنے متعلق اچھا گمان کیوں نہ کیا؟"

جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((لاَ تَحَاسَدُوْا ' وَلاَ تَنَاجَشُوْا ' وَلاَ تَبَاغَضُوْا ' وَلاَ تَدَابَرُوْا ' وَلا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَيْعِ بَعْضِكُمْ ' وَكُوْنُوْا عِبَادَاللّٰهِ اِخْوَانًا)) (۱۰۶)

"ایک دوسرے سے حسد نہ کرو' ایک دوسرے کے مقابلے میں بولی نہ بڑھاؤ (جب کہ خریدنے کا ارادہ نہ ہو)' ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو' ایک دوسرے سے قطع تعلق نہ کرو' ایک دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرو' اور اللہ کے بندے بھائی بھائی بن کر رہو"۔

اور فرمایا:

((اِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ ' فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِيْثِ)) (۱۰۷)

"بدگمانی سے بچو' یقیناً بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے"۔

⑮ اس سے فریب نہ کرے' اسے دھوکا نہ دے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴾ (الاحزاب: ۵۸)

"جو لوگ مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو ایذا پہنچاتے ہیں' حالانکہ انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا' تو ان لوگوں نے بہتان اور واضح گناہ (کا بوجھ) اٹھالیا۔"

اور فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴾ (النساء: ۱۱۲)

"جو غلطی یا گناہ کا کام کرتا ہے اور دوسرے کو اس کا الزام دے دیتا ہے تو اس نے جھوٹ اور واضح گناہ (کا بوجھ) اٹھالیا ہے۔"

ارشادِ نبوی ہے:

((مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلاَحَ فَلَيْسَ مِنَّا' وَمَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا)) (۱۰۸)

"جو ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں' اور جو ہمیں دھوکا دے وہ ہم میں سے نہیں"۔

اور آنحضرت ﷺ نے ایک صاحب سے فرمایا تھا:

((إِذَا بَايَعْتَ فَقُلْ لَا خِلَابَةَ)) (۱۰۹)

"جب تو خرید و فروخت کرے تو کہہ دیا کر کہ کوئی دھو کا فریب نہیں"۔

اور فرمایا:

((مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيْهِ اللّٰهُ رَعِيَّةً يَمُوْتُ يَوْمَ يَمُوْتُ وَهُوَ غَاشٌّ لِرَعِيَّتِهِ اِلَّا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ)) (۱۱۰)

"جس بندے کو اللہ تعالیٰ کسی رعیت کا نگران (اور حاکم) بنائے 'پھر جب وہ مرے تو اس حال میں مرے کہ اس نے اپنی رعیت کو دھو کا دیا ہو 'اللہ تعالیٰ اس شخص پر جنت حرام کر دیتے ہیں"۔

نیز ارشاد ہے:

((مَنْ خَبَّبَ زَوْجَةَ امْرِیءٍ اَوْ مَمْلُوْكَهُ فَلَيْسَ مِنَّا)) (۱۱۱)

"جو شخص کسی آدمی کی بیوی کو (خاوند کے خلاف) یا اس کے غلام کو (آقا کے خلاف) ابھارے وہ ہم میں سے نہیں"۔

(۱۶) بد عہدی نہ کرے 'خیانت نہ کرے 'جھوٹ نہ بولے 'قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول نہ کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ﴾ (المائدۃ: ۱)

"اے ایمان والو! معاہدے پورے کیا کرو۔"

اور فرمایا:

﴿ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ﴾ (البقرۃ: ۱۷۷)

"اور وعدہ پورا کرو۔ بے شک وعدہ کے متعلق سوال ہو گا۔"

اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((اَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا' وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا: اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ' وَاِذَا حَدَّثَ كَذَبَ' وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ' وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ)) (۱۱۲)

"چار (خصلتیں) جس میں ہوں وہ خالص منافق ہے اور جس میں ان (چاروں)

میں سے کوئی ایک خصلت پائی جائے اس میں نفاق کی خصلت ہے حتیٰ کہ اسے چھوڑ دے۔ جب اسے کوئی امانت سونپی جائے تو وہ خیانت کرے' جب بات کرے تو جھوٹ بولے' جب وعدہ کرے تو عہد شکنی کرے' جب جھگڑا کرے تو گالی بکے"۔

حدیث قدسی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی : ثَلاَثَةٌ اَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ اَعْطٰی بِیْ ثُمَّ غَدَرَ' وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَاَكَلَ ثَمَنَهُ' وَرَجُلٌ اسْتَأْجَرَ اَجِيْرًا فَاسْتَوْفٰی مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِهِ اَجْرَهُ)) (۱۱۳)

"اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: قیامت کے دن تین آدمیوں کے خلاف میں خود مدعی ہوں گا۔ ایک وہ شخص جس نے میرا نام لے کر عہد کیا پھر عہد شکنی کی' ایک وہ شخص جس نے کسی آزاد انسان کو بیچ دیا اور اس کی قیمت کھالی اور ایک وہ شخص جس نے کسی مزدور سے اجرت طے کی' پھر اس سے کام تو پورا لے لیا لیکن اس کی اجرت ادا نہیں کی"۔

جنابِ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ' وَاِذَا اُتْبِعَ اَحَدُكُمْ عَلٰی مَلِيْءٍ فَلْيَتْبَعْ)) (۱۱۴)

"غنی آدمی کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے' اور جب کسی کو صاحب ثروت آدمی کی طرف تحویل (۱۱۵) کیا جائے تو وہ اس سے مطالبہ کرے"۔

⑰ مسلمان کا مسلمان پر یہ بھی حق ہے کہ وہ اس سے حسن سلوک کرے۔ یعنی اس سے بھلائی کرے' اس کی تکلیف کا مداوا کرے' اسے خندہ پیشانی سے ملے' اس کے احسان کا اعتراف کرے' اس کی بدسلوکی کو معاف کردے' اس سے ایسا مطالبہ نہ کرے جس کو پورا کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہو' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ○ ﴾

(الاعراف : ۱۹۹)

"معافی اختیار کر' بھلائی کا حکم دے اور جاہلوں سے اعراض کر۔"

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((اِتَّقِ اللّٰهَ حَیْثُمَا کُنْتَ، وَاَتْبِعِ السَّیِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا، وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ))(۱۱۶)

"تو جہاں بھی ہو اللہ سے ڈرتا رہ، گناہ ہو جانے کے بعد نیکی کرلے، وہ اسے مٹادے گی، اور لوگوں سے خوش اخلاقی سے پیش آ"۔

⑱ بڑی عمر کے مسلمان کا احترام کرے اور چھوٹی عمر کے مسلمان سے شفقت سے پیش آئے۔ کیونکہ جنابِ مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا ہے:

((لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا وَیَرْحَمْ صَغِیْرَنَا))(۱۱۷)

"جو ہمارے بڑے کی عزت نہیں کرتا اور ہمارے چھوٹے پر رحم نہیں کرتا، وہ ہم میں سے نہیں"۔

نیز فرمانِ نبوی ہے:

((اِنَّ مِنْ اِجْلَالِ اللّٰهِ اِکْرَامَ ذِی الشَّیْبَةِ الْمُسْلِمِ))(۱۱۸)

"بوڑھے مسلمان کا احترام کرنا اللہ تعالیٰ کی عظمت کو تسلیم کرنے میں شامل ہے"۔

اور جنابِ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((کَبِّرْ کَبِّرْ)) "عمر میں بڑے کو فوقیت دو"۔(۱۱۹)

صحابہ کرامؓ چھوٹے بچے کو لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے کہ حضور ﷺ اس کے لئے برکت کی دعا فرمائیں اور اس کا نام تجویز فرمائیں تو آنحضرت ﷺ بچے کو گود میں لے لیتے تھے، حتیٰ کہ بعض اوقات بچہ گود میں پیشاب بھی کر دیتا تھا۔(۱۲۰)

جب رسول اللہ ﷺ سفر سے واپس آتے اور آگے سے بچے مل جاتے تو حضور علیہ السلام رک جاتے اور بچوں کو سواری پر اپنے آگے یا پیچھے سوار کرلیتے۔ اور صحابہ کرامؓ کو بھی فرماتے کہ بچوں کو سوار کرلیں۔ اس طرح آنجناب ﷺ بچوں سے شفقت کا اظہار فرماتے۔

⑲ ہر مسلمان سے انصاف پر مبنی معاملہ کرے۔ یعنی اس سے ایسا برتاؤ کرے جیسے برتاؤ کی خود اُس سے توقع رکھتا ہے۔ حدیث نبوی میں ہے:

((لَا یَسْتَکْمِلُ الْعَبْدُ الْاِیْمَانَ حَتّٰی یَکُوْنَ فِیْهِ ثَلَاثُ خِصَالٍ: الْاِنْفَاقُ مِنَ الْاِقْتَارِ، وَالْاِنْصَافُ مِنْ نَّفْسِهٖ، وَبَذْلُ السَّلَامِ))(۱۲۱)

"بندے کا ایمان مکمل نہیں ہوتا جب تک اس میں تین خصلتیں نہ ہوں' تنگ دستی کے وقت خرچ کرنا' اپنے آپ سے انصاف کا رویہ رکھنا اور سلام کرنا"۔

نیز فرمایا:

((مَنْ سَرَّهُ اَنْ يُزَحْزَحَ عَنِ النَّارِ' وَيَدْخُلَ الْجَنَّةَ فَلْتَاْتِه مَنِيَّتُهُ وَهُوَ يَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلَهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ' وَلْيُؤْتِ اِلَى النَّاسِ مَا يُحِبُّ اَنْ يُّؤْتٰى اِلَيْهِ)) (۱۴۲)

"جو شخص چاہتا ہے کہ جہنم سے بچالیا جائے اور جنت میں داخل ہو جائے تو اسے موت اس حالت میں آنی چاہیئے کہ وہ اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں' اور اسے چاہیئے کہ لوگوں سے ایسا برتاؤ کرے جیسا برتاؤ وہ خود اپنے لیے پسند کرتا ہے"۔

(۲۰) اس کی غلطیاں معاف کرے اور اس کے عیب پر پردہ ڈالے۔ اور اس سے وہ بات سننے کی کوشش نہ کرے جو وہ پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾

(المائدة: ۱۳)

"پس انہیں معاف کر دیجئے اور درگزر کیجئے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔"

اللہ جل شانہ کا یہ بھی فرمان ہے:

﴿ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ﴾ (البقرة: ۱۷۸)

"تو جس کے لیے اس کے بھائی کی طرف سے (دیت کا) کچھ (حصہ) معاف کر دیا جائے تو اچھے طریقے سے پیچھے لگے اور بہتر طریقے سے اسے ادائیگی کرے۔"

نیز فرمایا:

﴿ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ ؕ ﴾ (الشورٰی: ۴۰)

"پس جو معاف کرے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر و ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔"

اور فرمایا:

﴿ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ ﴾
(النّور : ۲۲)

"اور معاف کریں اور درگزر کریں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں بخش دے؟"

نیز ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ ﴾ (النّور : ۲۲)

"جو لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ مؤمنوں میں بے حیائی پھیل جائے ان کے لیے دنیا میں بھی دردناک عذاب ہے اور آخرت میں بھی۔"

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَا زَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ اِلَّا عِزًّا)) (۱۲۳)

"معاف کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بندے کی عزت ہی میں اضافہ فرماتا ہے"۔

اور ارشادِ نبوی ہے:

((وَاعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَكَ)) (۱۲۴)

"اور تو اسے معاف کر دے جو تجھ پر ظلم کرے"۔

نیز ارشاد ہے:

((لَا يَسْتُرُ عَبْدٌ عَبْدًا فِى الدُّنْيَا اِلَّا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) (۱۲۵)

"جو بندہ دنیا میں کسی بندے کی پردہ پوشی کرے گا قیامت کو اللہ تعالیٰ اس کی پردہ پوشی کرے گا"۔

ایک بار آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((يَا مَعْشَرَ مَنْ آمَنَ بِلِسَانِهٖ وَلَمْ يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِىْ قَلْبِهٖ لَا تَغْتَابُوا الْمُسْلِمِيْنَ وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِهِمْ، فَاِنَّهٗ مَنْ يَّتَّبِعْ عَوْرَةَ اَخِيْهِ الْمُسْلِمِ يَتَّبِعِ اللّٰهُ عَوْرَتَهٗ يَفْضَحْهُ، وَلَوْ كَانَ فِىْ جَوْفِ بَيْتِهٖ)) (۱۲۶)

"اے وہ افراد جو صرف زبان سے ایمان لائے ہو اور ان کے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا! مسلمانوں کی غیبت نہ کیا کرو، نہ ان کے عیب تلاش کرو، کیونکہ

جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے عیبوں کے پیچھے پڑے گا اللہ اس کے عیبوں کے پیچھے پڑ جائے گا' اور جس شخص کے عیبوں کے پیچھے اللہ پڑ گیا اسے رسوا کر کے رہے گا' اگرچہ وہ اپنے گھر کے اندر ہی بیٹھا رہے"۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے:

((مَنِ اسْتَمَعَ لِخَبَرِ قَوْمٍ وَهُمْ لَهُ كَارِهُوْنَ صُبَّ فِيْ أُذُنِهِ الْآنُكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))(۱۲۷)

"جو شخص لوگوں کی باتیں سنے جبکہ وہ اسے ناپسند کرتے ہوں تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے کانوں میں (پگھلا ہوا) سیسہ ڈالے گا"۔

(۲۱) جب اسے مدد کی ضرورت پڑے تو اس کی مدد کرے' اس کے کام کی تکمیل میں ممکن ہو تو سفارش بھی کرے۔ کیونکہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ﴾ (المائدة : ۲)

"نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں باہم تعاون کرو۔"

نیز ارشاد ہے:

﴿ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ﴾ (النساء : ۸۵)

"جو شخص اچھی شفاعت کرے اسے اس میں سے حصہ ملے گا۔"

آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

((مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ' وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ' وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ' وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ))(۱۲۸)

"جو شخص دنیا میں کسی مؤمن کی پریشانی دور کرے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ایک پریشانی دور کرے گا' اور جو شخص کسی تنگ دست کو سہولت بہم پہنچائے' اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس پر آسانی فرمائے گا' اور جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے' اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا' اور اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی مدد کرتا رہتا ہے جب تک کہ بندہ اپنے بھائی کی مدد

کرتا رہتا ہے"۔

اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((اِشْفَعُوْا تُؤْجَرُوْا وَيَقْضِي اللّٰهُ عَلٰى لِسَانِ نَبِيِّهٖ مَا شَاءَ)) (۱۲۹)

"شفاعت کرو' تمہیں ثواب مل جائے گا' اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان سے جو چاہے گا فیصلہ فرمادے گا"۔

(۴۲) مسلمان کے آداب میں یہ بھی شامل ہے کہ اگر وہ اللہ کا واسطہ دے کر پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دی جائے' اگر اللہ کا واسطہ دے کر کچھ مانگے تو اسے دے دیا جائے' جب وہ کوئی احسان کرے تو اس کا بدلہ دیا جائے یا اس کے لیے دعا کی جائے"۔

ارشادِ نبوی ہے:

((مَنِ اسْتَعَاذَكُمْ بِاللّٰهِ فَاَعِيْذُوْهُ' وَمَنْ سَاَلَكُمْ بِاللّٰهِ فَاَعْطُوْهُ' وَمَنْ دَعَاكُمْ فَاَجِيْبُوْهُ' وَمَنْ صَنَعَ اِلَيْكُمْ مَعْرُوْفًا فَكَافِئُوْهُ' فَاِنْ لَمْ تَجِدُوْا مَا تُكَافِئُوْنَهُ بِهٖ فَادْعُوْا لَهُ حَتّٰى تَرَوْا اَنَّكُمْ قَدْ كَافَاْتُمُوْهُ)) (۱۳۰)

"جو تم سے اللہ کا نام لے کر پناہ مانگے اسے پناہ دو' جو تم سے اللہ کا نام لے کر سوال کرے اسے عطا کرو' جو تمہیں دعوت دے اس کی دعوت قبول کرو' جو تمہارے ساتھ کوئی نیکی کرے اسے بدلہ دو' اگر تمہارے پاس اسے بدلہ دینے کے لیے کوئی (مناسب) چیز موجود نہ ہو تو اسے اتنی دعا دو کہ تم سمجھو کہ (اب) اس کے احسان کا بدلہ چکا دیا ہے"۔

حواشی

(۱۰۱) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب ما ینھٰی عن السباب واللعن۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر۔

(۱۰۲) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب ما ینھٰی عن السباب واللعن۔

(۱۰۳) صحیح مسلم' کتاب البر' باب النھی عن السباب۔

(۱۰۴) صحیح البخاری' کتاب الجنائز' باب ما ینھٰی عن سب الاموات۔

(۱۰۵) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب لا یسب الرجل والدہ (نحوہ)۔ وصحیح

مسلم' کتاب الایمان' باب الکبائر و اکبرھا۔

(۱۰۶) صحیح مسلم' کتاب البر' باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ واحتقارہ... الخ۔ وصحیح البخاری' کتاب الادب' باب ما ینھٰی عن التحاسد والتدابر۔

(۱۰۷) صحیح البخاری' کتاب الوصایا' باب قول اللّٰہ تعالیٰ: **مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَا اَوْ دَيْنٍ** ۔ وصحیح مسلم' کتاب البر' باب تحریم الظن والتجسس والتنافس والتناجش ونحوھا۔

(۱۰۸) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا۔ وصحیح البخاری' کتاب الفتن' باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا (پہلا فقرہ)

(۱۰۹) صحیح البخاری' کتاب البیوع' باب ما یکرہ من الخداع فی البیع۔ وصحیح مسلم' کتاب البیوع' باب من یخدع فی البیوع۔

(۱۱۰) صحیح البخاری' کتاب الاحکام' باب من استرعی رعیتہ فلم ینصح (نحوہ)۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب استحقاق الوالی الغاش لرعیتہ النار۔

(۱۱۱) سنن ابی داؤد' کتاب الادب' باب ما خبب مملوکا علی مولاہ۔

(۱۱۲) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب علامۃ المنافق۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب خصال المنافق

(۱۱۳) صحیح البخاری' کتاب البیوع' باب اثم من باع حرا۔

(۱۱۴) صحیح البخاری' کتاب الحوالات' باب فی الحوالۃ وھل یرجع فی الحوالۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب المساقاۃ' باب تحریم مطل الغنی وصحۃ الحوالۃ واستحباب قبولھا اذا احیل علی ملی۔

(۱۱۵) *یعنی اگر مقروض شخص کہے کہ فلاں شخص تمہیں رقم ادا کردے گا' تو قرض خواہ کو اس شخص سے رابطہ کرنا چاہئے کہ فلاں مقروض نے مجھے آپ کی طرف بھیجا ہے اور آپ میرا قرض ادا کردیں۔*

(۱۱۶) مستدرک حاکم و جامع الترمذی' کتاب البر' باب ما جاء فی معاشرۃ الناس۔ *امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔*

(۱۱۷) سنن ابی داؤد' کتاب الادب' باب فی الرحمۃ۔ *اس روایت میں یہ لفظ ہے "...جو ہمارے بڑے کا حق نہیں پہچانتا"*۔ وجامع الترمذی' کتاب البر' باب ما جاء فی رحمۃ الصبیان' *امام ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔*

(۱۱۸) سنن ابی داؤد' کتاب الادب' باب فی تنزیل الناس منازلھم۔

(۱۱۹) صحیح مسلم' کتاب القسامة والمحاربین والقصاص والدیات' باب القسامة۔

(۱۲۰) صحیح البخاری' کتاب الوضوء' باب بول الصبیان۔ وصحیح مسلم' کتاب الطھارة' باب حکم بول الطفل الرضیع و کیفیة غسله۔

(۱۲۱) مسند احمد۔ *صحیح بخاری میں قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے موقوفاً مروی ہے۔* صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب افشاء السلام من الایمان۔

(۱۲۲) *اسے خرائطی نے روایت کیا ہے اور زین الدین عراقی نے اس پر تنقید نہیں کی۔*

(۱۲۳) صحیح مسلم' کتاب البر' باب استحباب العفو والتواضع۔

(۱۲۴) مسند احمد' ح ۱۶۸۱۰

(۱۲۵) صحیح مسلم' کتاب البر' باب بشارة من ستر اللّٰہ علیه فی الدنیا بان یستر علیه فی الاخرة۔

(۱۲۶) جامع الترمذی' کتاب البر' باب ما جاء فی تعظیم المومن۔ *اس کی سند حسن ہے۔*

(۱۲۷) صحیح البخاری' کتاب تعبیر الرویا' باب من کذب فی حلمه۔

(۱۲۸) صحیح مسلم' کتاب الذکر' باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن والذکر۔ وصحیح البخاری' کتاب المظالم' باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمه (نحوه)۔

(۱۲۹) صحیح البخاری' کتاب الزکوٰة' باب التحریض علی الصدقة والشفاعة فیھا۔ وصحیح مسلم' کتاب البر' باب استحباب الشفاعة فیما لیس بحرام۔

(۱۳۰) مسند احمد۔ وسنن ابی داؤد' کتاب الزکوٰة' باب من عطیة من سال باللّٰہ۔ وسنن النسائی' کتاب الزکوة' باب من سال باللّٰہ (نحوه)۔ ومستدرک حاکم۔ *اس کی سند حسن ہے۔*

اطلاع برائے قارئین

بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر میثاق کا دسمبر ۲۰۰۲ء کا شمارہ بروقت شائع نہیں ہوسکا' جس پر ہم اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔ اس کی تلافی کے لئے زیرنظر شمارہ میں صفحات کا خاطر خواہ اضافہ کرکے اسے دو اشاعتوں کے قائم مقام کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے۔

گوشہ خواتین

سچی مسلمان خاتون کا کردار اور جدید خواتین

تحریر: این کے نذر اخیل' کراچی

خواتین معاشرے کی ترقی میں جو اہم کردار ادا کرتی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اصلاً خواتین ہی کے ہاتھوں میں نئی نسل کی تربیت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔قوم کے تعمیری ڈھانچے میں خواتین ریڑھ کی ہڈی کے مترادف ہیں' لہٰذا مسلمان خواتین کو اپنی حیثیت پہچانتے ہوئے علم وعمل' حسن سیرت و ریاضت' خوش اخلاقی' خلوص و اخلاص' حق گوئی وحق پرستی اور صلہ رحمی کی صفات کو اپنے اندر پروان چڑھانا چاہئے۔

لیکن آج ہماری خواتین مغربی تہذیب اور ان کے مذموم مقاصد کو پورا کرنے والی تحاریک اور این.جی اوز کے نعروں اور کھوکھلے دعووں سے متاثر ہوکر ان مخلوط محافل میں شریک ہوکر جس طرح عریانیت' بے شرمی اور بے حیائی کے مظاہروں پر مبنی عوامی پروگرام پر عمل پیرا ہیں یہ سب وہ شیطانی ایجنڈا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مشرقی عورت کو مساوات کے نام پر چادر اور چار دیواری سے محروم کر دیا جائے اور ملک پاکستان جو اسلام کے نام پر بنا' اس پر مغربی تہذیب مسلط کر دی جائے۔ایسی مغرب پسند خواتین کو دختران اسلام کے حالات کا مطالعہ کرنا چاہئے کہ اسلام کی بیٹیوں نے کس طرح دین کی خدمت کے لئے تحریکیں چلائیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے گھروں کو اور اپنے شوہروں کو بھی اسلام کی تعلیمات کے مطابق وقت دیا اور گھر کو جنت بنا دیا۔

زلیخا بیگم بھی ان خواتین میں سے ایک ہیں جنہیں ہندوستان میں دین اسلام کی خدمت کرنے کا موقع ملا اور اپنے کردار کی وجہ سے تاریخ میں ان کا نام لکھا گیا۔مولانا ابوالکلام آزاد سے کون واقف نہیں! آپ کی زوجہ محترمہ کا نام زلیخا بیگم تھا' جنہیں گھر والے تاج دلہن کے نام سے جبکہ باہر کے لوگ بیگم ابوالکلام آزاد کی حیثیت سے یاد کرتے تھے۔آپ کلکتہ میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام آفتاب الدین تھا۔ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔اردو' فارسی اور ادبی وعلمی شغف میں بچپن سے مشغول رہیں۔مطالعہ کا ذوق ایسا تھا کہ اس زمانے میں اس کی مثال ملنا مشکل تھا۔شادی کے وقت ان کی عمر ۱۲ یا ۱۳ سال اور ابوالکلام آزاد کی عمر ۱۸ سال تھی۔زلیخا بیگم جیسی نازک اندام حسین خاتون جن کا بچپن بہت آرام و راحت سے گزرا تھا

جب مولانا آزاد کی زوجیت میں آئیں تو اسی وقت ان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، مگر وہ بھی ناقابل تسخیر عزم و استقلال کا پہاڑ بن گئیں۔ انتہا یہ تھی کہ انتہائی تنگ دستی کے علاوہ عموماً شوہر سے جدائی بھی رہتی تھی مگر اس سب کے باوجود انہوں نے صبر و استقامت اور ثابت قدمی کی جو مثالیں قائم کیں وہ انہی کا حوصلہ تھا۔ بقول ایک سوانح نگار کے ''تاج دلہن نے خون جگر دے کر اپنے سرتاج کو سرتاج ہندوستان بنادیا۔'' عموماً ان دونوں کے درمیان جدائی رہتی اور جب کبھی وصال میسر آتا تو اس وقت بھی یہ وفادار بیوی ہمہ تن شوق بن کر استقبال کرتی اور اپنے شوہر کو ہر ممکن آرام پہنچانے کی کوشش کرتی تاکہ تھکا ماندہ دماغ جس کو سیاسی گتھیاں سلجھانی تھیں اور مذہبی و ادبی کام کرنا تھا' گھر کی خوشگوار فضا میں آرام پاکر زیادہ مؤثر کام کرسکے۔

وفاشعار بیوی

زلیخا بیگم کی زندگی کا ہر سانس اور ہر لمحہ مولانا آزاد کے لئے وقف تھا' ان کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہ کرتی تھیں۔ حمیدہ سلطان بیگم (زلیخا بیگم سے قریبی تعلق رکھنے والی ایک خاتون) کہتی ہیں کہ ایک صبح کو ہم زلیخا سے ملاقات کرنے کے لئے گئے تو بیگم آزاد کی نرگسی آنکھوں میں سرخ ڈورے دیکھ کر والدہ صاحبہ نے ان سے مسکراتے ہوئے کہا کہ کیا رتجگا کیا ہے بھاوج جو آنکھیں گلابی ہو رہی ہیں؟ وہ ہنس کر بولیں کہ آپ کی تو عادت ہے بنانے کی' آج کل مولانا قرآن کی تفسیر لکھ رہے ہیں' رات کو دو بجے کے بعد اٹھ بیٹھتے ہیں' جتنی دیر وہ لکھتے ہیں میں پنکھا جھلتی ہوں' موسم بہت گرم ہے' باہر بھی حبس رہتا ہے' بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ جاگیں' محنت کریں اور میں آرام سے سوتی رہوں۔

ایک اور جگہ حمیدہ سلطان تحریر کرتی ہیں کہ میں اپنی والدہ کے ساتھ مولانا کے گھر گئی' زلیخا بیگم کو اطلاع دی گئی مگر آنے میں انہوں نے تاخیر کی' جب آئیں تو معذرت کرتے ہوئے یوں عرض کیا: معاف کیجئے گا بہن! آپ کو اتنی دیر انتظار کرنا پڑا' میں مولانا کو کھانا کھلا رہی تھی' بہت تھوڑا اور سادہ کھانا کھاتے ہیں' دو چمچے ابلے ہوئے چاول' تھوڑی سی دال سبزی اور گوشت اور دہی۔ چونکہ صبح سویرے اٹھ جاتے ہیں اس لئے دوپہر کے کھانے کے بعد ۱۲ بجے سے پہلے لیٹ جاتے ہیں' پھر ۲ بجے غسل کر کے نماز پڑھتے ہیں' اس کے بعد کاموں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اور ملنے والوں کا رات تک تانتا بندھا رہتا ہے۔

ہمت کا پیکر

زلیخا بیگم میں اللہ کی مہربانی سے جہاں دیگر صفات بے مثل تھیں وہیں ایک اعلیٰ صفت صبر و

شکر کی بھی تھی۔ وہ کبھی بھی کسی بھی حال میں زبان پر شکوہ نہ لاتیں۔ جب پہلی مرتبہ مولانا کو ان کے سامنے گرفتار کیا گیا تو فطری محبت کی وجہ سے قدرے بے چینی کا اظہار کیا مگر بعد میں اس فطری محبت کی بھی کسی کے سامنے شکایت نہیں کی۔ بقول مولانا آزاد کے ۱۹۱۶ء میں جب پہلی بار گرفتاری پیش آئی تو اپنا اضطراب خاطر نہ روک سکی اور میں عرصہ تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعہ نے ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا ڈھنگ بدل دیا۔ اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کئے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار (کتاب مولانا آزاد)

مولانا آزاد کی اس بات کی تائید زلیخا بیگم کے اس خط سے ہوتی ہے جو انہوں نے مولانا آزاد کی فروری ۱۹۲۲ء میں سزایابی کے بعد گاندھی جی کے نام احمد آباد اور برودلی کے پتوں پر بھیجا تھا، لیکن سینٹرل ٹیلی گراف آفس کلکتہ نے اسے روک لیا تھا زلیخا بیگم نے اس میں یہ الفاظ لکھے تھے:

> ''میرے شوہر مولانا ابوالکلام آزاد کے مقدمہ کا فیصلہ آج سنا دیا گیا۔ انہیں صرف ایک سال قید سخت کی سزا دی گئی۔ یہ نہایت تعجب انگیز طور پر اس سے بدرجہا کم ہے جس کے سننے کے لئے ہم تیار تھے۔ اگر سزا اور قید قومی خدمت کا معاوضہ ہے تو آپ تسلیم کریں گے کہ اس معاملے میں بھی ان کے ساتھ سخت ناانصافی برتی گئی۔ یہ تو کم سے کم بھی نہیں ہے جس کے وہ مستحق تھے۔ میں آپ کو یہ اطلاع دینے کی جرأت کرتی ہوں کہ بنگال میں جو جگہ ان کی خدمت کے لئے خالی ہوئی ہے اس کے لئے میں نے اپنی ناچیز خدمات پیش کر دی ہیں اور وہ تمام کام بدستور جاری رہیں گے جو اُن کی موجودگی میں انجام پاتے تھے۔ میرے لئے یہ ایک بہت بڑا بوجھ ہے لیکن میں خدا کی مدد سے پوری امید رکھتی ہوں، البتہ ان کی جگہ صرف بنگال میں خالی نہیں بلکہ تمام ملک میں، اور اس کے لئے سعی کرنا میری دسترس سے بالکل باہر ہے۔
>
> میں پہلے چار سال تک ان کی نظر بندی کے زمانے میں اپنی ایک ابتدائی آزمائش پوری کر چکی ہوں اور میں کہہ سکتی ہوں کہ اس دوسری آزمائش میں بھی پوری اتروں گی۔ گزشتہ پانچ سال سے میری صحت نہایت کمزور ہو گئی ہے۔ دماغی محنت سے بالکل مجبور ہوں، اس لئے باوجود میری خواہش کے مولانا ہمیشہ اس سے مانع رہے کہ میں کسی طرح محنت اور مشغولیت کے کام میں حصہ لوں، لیکن میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ ان کی سزایابی کے بعد مجھے اپنی ناچیز ہستی کو ادائے فرض کے لئے وقف کر دینا چاہئے۔ میں آج سے بنگال پروفیشنل خلافت کمیٹی کے تمام کاموں کو اپنے بھائی کی اعانت سے انجام دوں گی......''

شرم وحیا

زلیخا بیگم ایک عالمہ فاضلہ خاتون تھیں اور دوسری حیثیت میں عورت کو کس طرح رہنا

چاہئے اس سے بخوبی واقف تھیں۔ اس سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں:

''اللہ اللہ' ایک اتنے بڑے پبلک لیڈر کی بیوی کے لئے اس بیسویں صدی میں پردہ نشین رہنا خود ہی کیا کم جرم تھا کہ اپنا وقت بجائے کلب' ہال روم اور سنیما ہال میں صرف کرنے کے اگلی جنتی بیویوں کی طرح کھانا کھلانا' ان کو پنکھا جھلنا' ان کے خیال سے راتوں کو خود اپنی نیند حرام کرنا اور ٹیلی فون کو شوقیہ استعمال کرنے کی بجائے نامحرم کے خیال سے اس کے سننے میں بھی احتیاط کرنا' اور کمال یہ کہ شوہر کا نام لیتے بھی شرمانا' ایسی بیوی کو حق کیا تھا آزادی اور بے باکی کی اس فضا میں زیادہ جیتے رہنے کا' اچھا ہی ہوا وہ جلد ہی جنت کے سفر پر روانہ ہوگئی۔'' (رسالہ ماحول' آزاد نمبر)

آخرت کی جانب سفر

۱۹۴۵ء میں زلیخا بیگم کو تپ دق کا عارضہ لاحق ہوا۔ اس بیماری میں بھی ہر لحہ ان کو اپنی بیماری کے بجائے اپنے محبوب سرتاج کی فکر ہی سوار رہتی تھی۔ اس بارے میں مولانا آزاد کا اقتباس ملتا ہے:

''میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۱۹۴۱ء میں جب میں سنی تال میں مقید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لئے تشویش خاطر کا موجب ہوگا' مجھے اطلاع نہیں دی گئی' لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم وبیش علالت کی حالت میں گزارا' مجھے قید خانے میں اس کے خطوط ملتے رہے' ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔''

زلیخا کو ایک ہی بیماری تھی اور وہ اپنے محبوب شوہر کا شوقِ دیدار' مگر وہ اس سے ہمیشہ محروم ہی رہیں اور وہ بھی اس کیفیت میں کہ کبھی زندگی کی خبر اور کبھی موت کی خبر اور پھر اسیری کا پیغام۔ ایک موقع پر مولانا فرماتے ہیں:

''۳راگست کو جب میں بمبئی کے لئے روانہ ہو رہا تھا تو حسب معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لئے آئیں۔ میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آیا تو ۱۳راگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا کچھ نہ کہا' لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشک بار تھا۔ گزشتہ ۳۵ برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتار رہا ہوں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت میں غالب آ گئی تھی۔ میں نے اس وقت

ایسا ہی خیال کیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورت حال کا ایک جھول احساس ہونے لگا تھا' شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لئے کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا یا وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔''

ادھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ مولانا بمبئی گئے اور ۹/اگست کو گرفتار کر لئے گئے۔ زلیخا بیگم کو جب یہ اطلاع ہوئی تو ان کی بیماری میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ بستر پر دراز ہو گئیں۔ معالجین دواؤں پر اصرار کرتے مگر ان کو تو مولانا کے دیدار ہی کی تڑپ تھی۔ ان کا اصرار تھا کہ مجھ کو مولانا کا دیدار کروادو۔ ادھر قلعہ احمد نگر میں مولانا مقید تھے۔ مولانا کو اپنی شریک حیات کی طرف سے بے حد فکر تھی مگر اس کا اظہار کسی کے سامنے نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں جتنے خطوط لکھے صرف ایک خط میں اپنی بیوی کا تذکرہ تھا۔

شروع میں کسی کو مولانا کو خط لکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک ماہ سے زائد عرصہ تک پابندی رہی اور جب یہ پابندی اٹھالی گئی تو سب سے پہلا خط ۱۷/ستمبر کو ملا جس میں زلیخا بیگم نے سب کچھ لکھا مگر اپنی بیماری کا تذکرہ نہیں کیا۔ مولانا آزاد ''غبارِ خاطر'' میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنی بیماری کا تذکرہ کر کے مجھے پریشانِ خاطر کرنا پسند نہیں کرتی۔ گھر کے بعض دوسرے عزیزوں سے حالت دریافت کر لیتا تھا۔

۱۵ فروری کو مجھے ایک خط ۲ فروری کا بھیجا ہوا ملا جس میں لکھا تھا کہ اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں نے تار کے ذریعے مزید صورت حال دریافت کی تو ایک ہفتہ کے بعد جواب ملا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔

سفر آخرت پر روانگی

اس سلسلے میں ''تاریخ کانگریس'' میں یہ عبارت ملتی ہے کہ سسکتے سسکتے وہ موت کے قریب تر ہوتی گئی۔ بیماری نے یہ حال کر دیا کہ ان پر غشی طاری رہنے لگی۔ گزشتہ جمعرات کے دن ۸/اپریل کو ڈاکٹر محمد اویس صلاح کار نہایت مایوسی کے عالم میں ان کے کمرے سے باہر آئے اور کہا اگر مولانا کسی طرح آ سکیں تو مریضہ میں کچھ حوصلہ پیدا ہونے کا امکان ہے۔ تقریباً ۱۱ بجے رات کو ہوش میں آئیں اور کہا انہیں بٹھا دیا جائے۔ گھر کے ہر فرد سے وہ باتیں کرنے لگیں۔ نوکروں اور خدمت گزاروں سے معافی کی طلب گار ہوئیں۔ کہا کہ میری بیماری کی وجہ سے آپ لوگوں کو بہت زحمتیں اٹھانی پڑیں۔ تمام حاضرین ان کی سنبھلی ہوئی حالت سے خوش نظر آتے تھے۔ انہوں نے دروازے پر نظر ڈالی اور پوچھا کہ آیا مولانا آ گئے؟ نہیں میں جواب پا

کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور خاموش بیٹھ گئیں' پھر اپنے خادموں کو کچھ تحفے تحائف عنایت کرنے کے وعدے کیے اور تلاوت قرآن کی التجا کی۔ قرآن کی تلاوت ہوتی رہی تا آنکہ صبح کے وقت ان کی روح پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۱۹ اپریل ۱۹۴۳ء کو زلیخا بیگم کا کلکتہ میں انتقال ہوا اور مولانا آزاد نے فرمایا:

''مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی' میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا' مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔''

عوام اور زلیخا بیگم

زلیخا بیگم کے انتقال سے برعظیم کی فضائیں اداس ہو گئیں۔ تمام لوگ ہر قسم کے امتیازات اور اختلافات سے بالاتر ہو کر جامع مسجد میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ نماز جنازہ میں ہزاروں کا مجمع تھا۔ جب جنازہ آخری آرام گاہ کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو سارے گلی کوچوں میں انسان ہی انسان نظر آ رہے تھے' جن کو زلیخا بیگم کے انتقال نے غم زدہ کر دیا تھا۔ اس موقع پر ابراہیم ہوش نے ۱۹ اپریل ۱۹۴۳ء کو تعزیتی جلسے میں ایک نظم پڑھی جس سے سامعین سب کے سب رونے لگے۔

مولانا کی رہائی

زلیخا بیگم کے انتقال کے وقت مولانا جیل میں تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا' انہی کی زبانی سنئے' وہ فرماتے ہیں جیل سے دو سال چھ دن کے بعد جب رہا ہوا اور کلکتہ ایکسپریس سے روانہ ہو کر جب کلکتہ پہنچا تو کار پل کے اوپر سے گزر رہی تھی' مجھے گزرا ہوا زمانہ یاد آنے لگا' تین سال پیچھے کا وہ دن یاد آیا جب میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کی غرض سے بمبئی روانہ ہو رہا تھا' میری بیوی گھر کے دروازے تک مجھے رخصت کرنے آئی تھی' اب تین سال کے بعد میں واپس آ رہا تھا مگر وہ قبر کے آغوش میں تھی اور میرا گھر خالی تھا۔ مجھے ورڈلاس کا یہ شعر یاد آیا:

مگر وہ اپنی قبر میں ہے اور ہائے میری دنیا بدل گئی!

میں نے اپنے ساتھیوں سے کار واپس کرنے کے لئے کہا' کیونکہ گھر جانے سے پہلے میں ان کی قبر پر جانا چاہتا تھا۔ میری کار ہاروں سے لدی ہوئی تھی' میں نے ان میں سے ایک ہار لے کر قبر پر ڈال دیا اور خاموشی کے ساتھ فاتحہ پڑھی ؎

موت کے بعد ہے بیدار دلوں کو آرام
نیند بھر کر وہی سویا جو کہ جاگا ہو گا!